مرزا غالبؔ کی شخصیت و فن پر مختلف جرائد و
کتب کے منتخب مضامین
مرتب ☜ : غلام مصطفیٰ دائمؔ اعوان

جہانِ غالب

یادگار حکیم عبدالحمیدؒ

جلد:8 شمارہ۔15

نگراں

پروفیسر شمیم حنفی

مدیر

ڈاکٹر عقیل احمد

غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی

جہانِ غالب

یادگار حکیم عبدالحمیدؒ

جلد: 8 شمارہ: 15 دسمبر 2012 تا مئی 2013ء

قیمت فی شمارہ: -/20 روپے

قیمت سالانہ: -/40 روپے

ڈاک سے: -/50 روپے

کمپوزنگ: بشریٰ بیگم

طابع و ناشر

ڈاکٹر عقیل احمد

سکریٹری: غالب اکیڈمی

بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی۔110013

فون نمبر: 9868221198, 24351098

ای میل: ghalibacademy@rediffmail.com

ویب سائٹ: www.ghalibacademy.org

پرنٹر، پبلشر ڈاکٹر عقیل احمد نے غالب اکیڈمی کی طرف سے ایم آر پرنٹرس 2816 گلی گڑھیا، دریا گنج، نئی دہلی سے چھپواکر غالب اکیڈمی 168/1 بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی 13 سے شائع کیا۔ ایڈیٹر: عقیل احمد

ڈاکٹر نیلوفر نازنحوی

غالب بحیثیت فارسی شاعر

اسد اللہ خان نام، مرزا نوشہ خان عرف نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ خطاب تھا۔ پہلے پہل اسد تخلص تھا اور بعد میں غالب ہوگیا۔ ان کا خاندان ایران سے تھا۔ ان کے دادا شاہ عالم کے زمانے میں دلی آئے تھے۔ ان کے والد آصف الدولہ کے زمانے میں لکھنو آئے تھے۔ لکھنو سے حیدر آباد چلے گئے۔ غالب نے آگرہ میں 1797 میں اپنی آنکھیں اس دنیا میں کھولیں بعد میں دلی میں رہائش پذیر ہوئے۔ ابھی پانچ سال کے ہوئے تھے کہ والد نے اس جہاں فانی سے کوچ کیا۔ 1869 میں غالب نے اس جہان فانی کو خیر باد کہا۔

غالب اردو کے ایک بہت بزرگ شاعر مانے جاتے ہیں۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اردو غزل کا بادشاہ ہے اردو میں اس کا ایک دیوان ہے اور اس کے علاوہ فارسی میں بھی اس کا ایک دیوان ہے۔ مگر اس نے اپنے اردو دیوان کو" بے رنگ" دیوان سے یاد کیا ہے اور فارسی دیوان کو" دیوان رنگ رنگ" سے یاد کیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے فارسی دیوان میں رنگ برنگ کے نقوش ہیں اور اردو دیوان بے رنگ ہے وہ دونوں زبانوں کو یکساں پسند کرتے تھے اور ہر دو زبانوں کے استاد تھے۔ یہی نہیں بلکہ دونوں صنفوں کے بھی استاد تھے۔ یعنی نظم اور نثر۔ اردو زبان میں خطوط نویسی کے بنیاد گذار بھی ہیں۔ کیونکہ یہی طرز تحریر جدیدیت کی علم اٹھائے ہے۔ اس کے نوشتے شیرین اور شگفتہ ہیں۔ فارسی میں ان کا جو دیوان ہے چاہتے تھے کہ لوگ انہیں اسی کے توسط سے یاد کریں۔ لیکن لوگوں کو ان کے اردو اشعار زیادہ پسند ہیں۔ ان کے اردو اشعار کو پڑھتے ہیں، یاد کرتے ہیں اور ان سے محظوظ ہوتے ہیں۔ ان کے اشعار کو لوگ اپنی گفتگو میں محاوروں کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور کبھی کبھی ایک کلمہ کو تبدیل کر کے اس وزن پر دوسرا کلمہ وہاں پر استعمال کرتے

ہیں اور اپنا کام نکالتے ہیں۔ ان کے فارسی اشعار بہت معنی خیز ہیں اور فہم و فراست میں اولیٰ ہیں۔ چنانچہ خود کہا ہے۔

فارسی بین تا ببینی نقش ہای رنگ رنگ   بگذر از مجموعہ اردو کہ بی رنگ من است

اگر تمہیں رنگین نقوش دیکھنے ہیں تو تم میرا فارسی کلام دیکھو۔ میرے اردو کلام کو رہنے دو کیونکہ وہ میرا بے رنگ کلام ہے۔ لیکن ہم نے غالب کے فارسی کلام کے ساتھ بڑی ناانصافی برتی ہے اور وہ ناانصافی آج بھی ہو رہی ہے۔ کیونکہ ہم فارسی پڑھنے والے یا پڑھانے والے قدیم اساتذہ کا کلام درس و تدریس کے تحت پڑھتے پڑھاتے تو ہیں مگر غالب جیسے استادوں کے کلام کو فارسی نصاب میں شامل نہیں کرتے اس وجہ سے فارسی کے شاگرد غالب سے ناآشنا رہتے ہیں۔

آج کل فارسی سے شغف رکھنے والے لوگوں نے غالب کو جاننا شروع کیا ہے۔ کچھ لوگوں نے غالب کے اشعار پر کتابیں لکھی ہیں۔ شفیع شوق صاحب نے غالب کے چند اشعار کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس ترجمہ سے لوگ جو فارسی جاننے والے نہیں بھی ہیں غالب کو پڑھ سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں۔ علی اصغر حکمت صاحب نے غالب کو ہند کا خاتم الشعرا کہا ہے داریوش صاحب تاریخ ادبیات فارسی میں غالب کی جگہ کو مختص کرتے ہیں

غالب کہ کلام او ثاقب بود   استاد حزار طالب وصائب بود

در ملک سخن چون اسد للہی کرد   بر جملہ سخنوران فروزان غالب بود

غالب جانتے تھے کہ ان کی وفات کے بعد ان کی شاعری کی شہرت ہوگی اور لوگ ان کی شاعری سے مست ہو جائیں گے۔ مگر ان کے دور میں اس کے خریداروں کا قحط تھا۔

تازدیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن   این مئی از قحط خریداری کہن خواہد شدن

کوکبم را در عدم اوج قبولی بودہ است   شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

غالب کے بارے میں مشہور ہے کہ جب وہ کسی مشاعرے میں جاتے تھے اور کوئی غزل پڑھتے تھے۔ لوگ چونکہ ان کے اشعار کو نہیں سمجھتے تھے۔ اس لئے داد تحسین نہیں دیتے تھے اور نہ ہی

ان کے اشعار سے کوئی لذت ہی لیتے تھے وہ اس وقت ان سے بددل ہو جاتے اور کہتے۔ "لوگ میرے اشعار کو نہیں سمجھتے ہیں تو لعنت ہے۔"

بے شک غالب کے چند ایک اشعار سبک ہندی میں لکھے گئے ہیں اور دیکھنے اور سننے میں مشکل پسند ہیں۔ لیکن جب ہم وقت کے ساتھ ان کے اشعار پڑھتے ہیں تب سمجھتے ہیں کہ ان کے اشعار کس قدر معنی وادراک کے الفاظ اس میں پروئے ہوئے ہیں۔

معشوق کی بے وفائی جس کو عام طور پر فارسی شاعری میں خاص جگہ دی گئی ہے۔ ذیل کے اشعار میں دیکھا جا سکتا ہے کہ محبوب کی بے وفائی کے مضمون کو غالب نے کس طرح باندھا ہے۔

زما گسستی، وبا دیگران گرو بستی بیا کہ عہد وفا نیست استوار بیا

(ہم سے دور جا کر دوسروں کے ساتھ تم نے گٹھ جوڑ باندھ لیا۔ آجاؤ کیونکہ عہد وفا استوار نہیں ہے)

وداع ووصل جدا گانہ لذتی دارد ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا

(وداع ووصل ہر دو کی اپنی اپنی لذت ہے مگر اگر تم ہزار بار جاؤ گے تو لاکھ بار واپس آجاؤ۔)

اور غالب حسن معشوق کی تعریف وتوصیف کرتا ہے تو کبھی اس کو تابناکی آفتاب کہہ دیتا ہے اور کبھی معشوق کے حسن کی پرستش کرتا ہے۔

میں چاہتی ہوں کہ غالب کی ایک غزل کی توضیح دل اور قاری کے سامنے رکھوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر غالب نے فارسی کا دیوان نہ لکھا ہوتا صرف ذیل کی غزل ہی لکھی ہوتی تب بھی فارسی زبان وادبیات پر غالب ہوتی۔

بیا وجوش تمنائے دیدنم بنگر چو اشک از سر مژگان چکیدنم بنگر

میرے محبوب آجاؤ دیکھو کہ تمہیں دیکھنے کی کیسی تمنا میری آنکھوں میں ہے۔ اشکوں کی طرح مژگان سے میرا ٹپکنا دیکھو۔

زمن بجرم تپیدن کنارہ می کردی بیا بخاک من وآرمیدنم بنگر

ہمیشہ میری بے قراری کے جرم کے لیے تم نے مجھ سے کنارہ کیا۔ اب آج میری خاک پر آجاؤ اور میرا آرام سے رہنا دیکھو

شنیدہ ام کہ نہ بینی وتا امید نیم　　ندیدن تو شنیدم، شنیدنم بنگر

میں نے سنا کہ تو مجھے نہ دیکھے گا۔ مگر تو اس بات کی طرف توجہ دے کہ یہ بات سننے کے بعد بھی امیدوار ہوں۔ میری قوی السمع کی داد دے۔ کہ اس بدخبر کے بعد بھی زندہ ہوں۔

دمیدوانہ، بالیدوآشیا نگہ شد　　در انتظار ہمادام، چیدنم بنگر

یہ شعر تو اس غزل کا شاہ بیت ہے۔ کیا کلمات کے لحاظ سے اور کیا تراکیب کے لحاظ سے۔ کس قدر خوشنما اور دلکش ہے۔ غالب نے دام میں دانہ ڈالا تھا کہ ہما اس کے دام پھنس جائے۔ مگر اس کی بدقسمتی دیکھئے کہ وہ دانہ اگ گیا، بڑا ہوگیا، اور ایک ایسے درخت کی شکل میں آگیا کہ اس پر چڑیوں نے گھونسلے بنائے اور میں انتظار ہی کرتا رہا۔

نیاز مندیٔ حسرت کشان نمی دانی　　نگاہ من شو دزدیدہ دیدنم بنگر

تمہیں معلوم نہیں کہ کس قدر حسرت دیدار اور حسرت نیاز مندی ہے۔ اگر تم میری حسرت دیکھنا چاہتے ہو تو میری آنکھ بن جاؤ اور میں کیسی وزدیدہ نگاہی سے تمہیں دیکھتا ہوں وہ دیکھ لو۔

اگر ہوای تماشای گلستان داری　　بیاد عالم درخون تپیدنم بنگر

اگر میرے معشوق تمہیں گلستان دیکھنے کی آرزو ہے تو آجاؤ دیکھ لو کہ میں عالم خون میں کس قدر گل وگلستان ہو چکا ہوں

غالب ہمیشہ عاشقوں کے دلوں میں رہیں گے۔ وہاں زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ایک زمانہ آئے گا جب ہم غالب کو نہ صرف اردو بلکہ فارسی کے توسط سے بھی یاد کریں گے اور غالب کو فارسی کے توسط سے بھی سلام بھیجیں گے۔

OO

قاضی جمال حسین

تعبیر غالب
(ایک تنقیدی جائزہ)

غالب نے اپنے اشعار میں جو طریقۂ کار اختیار کیا ہے اور جو مضامین نظم کیے ہیں وہ اپنی تہ داری اور ندرت کی وجہ سے حیرت سرا کا لطف رکھتے ہیں۔ کلام غالب کی مختلف شرحوں کے مطالعے سے بس یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ غالب نے الفاظ کی مخصوص ترتیب سے ایسا متن بنایا ہے کہ معانی کے امکانات ہنوز دریافت طلب ہیں۔ وجود سے گزر کر عدم کی وسعتیں جس شاعر کے تخیل کی جولانگاہ بن جائے، اس کے اشعار کو تعبیر کی گرفت سے لینا دشوار ہے۔ غالب کے کلام میں معنی کی پیچیدگی اکثر صورتوں میں معنی کو ناقابل ادراک بنا دیتی ہے یا خود غالب کو بھی اس بات کا احساس تھا لیکن روش عام پر چل کر انبوہ کا حصہ بننا گوارا نہ تھا چنانچہ بیدل کی طرح انہوں نے بھی اپنی بہار آپ ایجاد کی اور اردو شاعری میں ایک نئی روایت کا آغاز کیا۔

اسد ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے
مجھے اس بہار ایجادیٔ بیدل پسند آیا

زمانے کی ناقدری کا شکوہ تو غالب نے بارہا کیا ہے اور ہمیشہ یہ گلہ رہا کہ نثر و نظم کی داد انہیں بانداز ۂ بایست کہیں نہیں ملی۔ ستائش اور صلے سے بے نیازی کے اعلان کے باوجود ان کے لہجے میں افسردگی اور ملال کی کیفیت کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے جب وہ یہ کہتے ہیں کہ

اور تو رکھنے کو ہم دہر میں کیا رکھتے تھے
فقط اک شعر میں انداز رسا رکھتے تھے
اس کا یہ حال کہ کوئی نہ ادا سنج ملا
آپ کہتے تھے ہم اور آپ اٹھا رکھتے تھے

تو ان کی شکست کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ غالب کا مسئلہ یہ تھا کہ اپنی فکر اور اندیشے سے کسی قسم کی مفاہمت کرنے کے بجائے انھوں نے وہ پیرایۂ بیان اختیار کیا جو عوام کے ذوق اور

استعداد سے یہ مراحل دور تھا۔ تفہیم غالب سے متعلق مسائل کا یہی نقطۂ آغاز ہے حالی کہتے ہیں۔

"جس قدر رعائی اور بلند خیالات مرزا کے ریختہ میں نکلیں گے اس قدر کسی ریختہ گو کے کلام میں نکلنے کی توقع نہیں۔ البتہ ہم کو مرزا کے عمدہ اشعار کو جانچنے کے لیے ایک جداگانہ معیار مقرر کرنا پڑے گا۔ جس کو امید ہے اہل انصاف تسلیم کریں گے(یادگار غالب 119)

یہ وجہ ہے کہ جتنی شرحیں مرزا کے اردو کلام کی لکھی گئیں کسی دوسرے شاعر کی نہیں لکھی گئیں۔ غالب نے اپنی مشکل پسندی اور زمانے کی ناقدری کے مضامین تو بار بانظم کئے ہیں لیکن حیرت اس وقت ہوتی ہے جب غالب آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے معنی تک رسائی کو ناممکن قرار دیتا ہے اور اسے ایک سربستہ راز کہتا ہے۔ معنی تک رسائی کی ہر تدبیر وحشت میں کی گئی ایک لاحاصل کوشش ہے۔ شعر

شوقِ اظہار غیر از وحشتِ مجنوں نہیں لیلیٰ معنی اسد محمل نشین راز ہے

اظہار کی جگہ تدابیر اور بیان کے تمام پیرایے، وحشت میں کی گئی شوخی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ معنی ایسا معشوق ہے جو راز کے پردے سے کسی طور باہر آتا ہی نہیں۔ یہ معنی کی سرشت اور اس کا خلقی وصف ہے۔ ایسی صورت میں غالب کے کلام کی ایک سے زیادہ شرحوں کا جواز بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

نیر مسعود کی کتاب تعبیر غالب اس اعتبار سے تفہیم غالب کا اگلا قدم ہے کہ مصنف نے پیش رو شارحین کے نکات کا اعلان کرنے کے بجائے متن سے ایسے معانی برآمد کئے ہیں یا پہلے بیان شدہ معانی میں بعض ایسی جہات کا اضافہ کیا ہے جن تک گزشتہ شارحین نہیں پہنچ سکے۔ نیر صاحب نے اکثر مقامات پر گزشتہ شارحین سے اختلاف کرتے ہوئے ان تسامحات کی نشان دہی کی ہے جو ان سے سرزد ہوئی ہیں۔ تعبیر غالب کے مطالعے کے دوران بار بار اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ کلام غالب میں امکانات کے بہت سے پہلو ابھی تک نادیدہ تھے جنہیں نیر مسعود صاحب اپنی دقیقہ سنجی ژرف نگاہی اور شعری ذوق کی مدد سے دریافت کیا ہے۔

اب یہ خیال تو نہایت فرسودہ اور پامال ہو چکا ہے کہ شعر کا صحیح معنی شاعر کے ذہن اور اس کے عندیہ میں ہوتا ہے۔ اس لئے کسی تعین کی قابل قبول تعبیر وہی ہے جو شاعر کے عندیہ کے مطابق ہو۔

بہ قول شمس الرحمٰن فاروقی:

> شعر کا ہم پر یہ حق ہے کہ ہم اس کے باریک ترین معنی تلاش کریں اور جتنے کثیر معنی شعر میں ممکن ہوں ان کو دریافت کریں۔ بڑے شعر کی خوبی یہ ہے کہ وہ مختلف زمانوں اور مختلف تناظر میں بامعنی رہتا ہے۔ ایسا اس وقت ممکن ہوسکتا ہے جب اس میں معنی کے امکانات کی کثرت ہو۔ (تفہیم غالب 16)

تعبیر غالب 1973 میں کتاب نگر دین دیال روڈ لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ کتاب کے ابتدائیہ میں یہ وضاحت بھی موجود ہے کہ پیش نظر مجموعہ میں (تین مضامین کے سوا) غالب کے متداول دیوان میں سے چند شعروں کے وہ مفاہیم تلاش کئے گئے ہیں۔ جن کی طرف شعر کے الفاظ رہنمائی کرتے ہیں۔ چنانچہ نیر صاحب نے ان تمام مفاہیم کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے جو متن سے برآمد ہو سکتے ہیں اور ان معانی پر سوالیہ نشان قائم کیا ہے جو شارحین نے بیان تو کیا ہے لیکن ان کی سند زبان کے روزمرے اور اساتذہ کے کلام میں نہیں ملتی۔ کل 16 (سولہ) اشعار کی شرحوں پر مشتمل نیر صاحب کی یہ کتاب غالبیات میں گراں قدر اضافہ ہے۔ ان چند اشعار کی شرحیں اگر توجہ سے پڑھ لی جائیں تو نہ صرف یہ کہ غالب کے دیگر اشعار کی تفہیم کی راہیں کھلتی ہیں بلکہ مطالعہ متن کے آداب سے بھی قاری واقف ہوجاتا ہے۔

کتاب کا پہلا مضمون "تفہیم غالب پر ایک گفتگو" کے عنوان سے شامل ہے جس میں غالب کے مشہور شعر ؂

آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

پر گفتگو کی گئی ہے۔ صفحہ 9 تا 45 یعنی 36 صفحات پر مشتمل اس تحریر میں وہ تحریری مباحثہ یکجا کردیا گیا ہے جو شب خون کے مئی 1968 کے شمارے سے شروع ہوا تھا، جس میں فاروقی صاحب نے مذکورہ بالا شعر کی شرح لکھی تھی اور سعید اختر خلش نے فاروقی کی تشریح سے اختلاف کیا تھا۔ فروری 1969 کے شمارے میں ابرار احمد صاحب بھی بحث میں شامل ہوگئے۔ انھوں نے

فاروقی کی حمایت اور نیر صاحب کی تردید میں دلائل پیش کئے۔ یہاں فقط یہ بتانا مقصود ہے کہ اس شعر کی تشریح میں نیر مسعود کا تبحر علمی، فارسی شعر و ادب کی روایت پر ان کی نظر، اور ان کا شعری ذوق قاری کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ آشفتگی سویدا، نقش اور سرمایہ کی لغوی تحقیق اور ان الفاظ کی مختلف دلالتوں پر سیر حاصل بحث فاروقی کے مقابلہ میں نیر صاحب کے موقف کی تائید کرتی ہے۔ سند میں فارسی شعرا کے کلام سے استشہاد اس پر مستزاد ہے۔ تاثر علمی انکسار کے باوجود نیر صاحب کی صاف گوئی اور ان کا دوٹوک انداز دیدنی ہے۔ یہ جملے ملاحظہ ہوں:

1۔ ''نقش سویدا کیا درست'' کا مطلب فاروقی صاحب نقش سویدا مٹا دیا لیتے ہیں یہ مفہوم درست نہیں

2۔ انھوں نے (فاروقی نے) نقش سویدا کی ترکیب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں خاص طور پر اختلاف کی بہت گنجائش ہے۔

3۔ فاروقی کا یہ بیان محل نظر ہے

4۔ فاروقی کے اس بیان میں استعارہ اور تشبیہ کی غایت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اور ابرار صاحب کی تو نیر مسعود نے سخت گرفت کی ہے۔ بحث میں حصہ لیتے ہوئے ابرار صاحب نے فاروقی صاحب کی حمایت میں لکھا تھا:

''سویدا عند ابدطبا ایک خط کا نام ہے اس لئے نقش سویدا کی ترکیب لب دریا کے کنارے کی طرح غلط ہے۔ غرض اس شعر میں لفظ سویدا معنی ''خط'' ان کی بحث میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ نیر صاحب جواب میں لکھتے ہیں۔

''مصباح اللغات'' جس کا ابرار صاحب نے حوالہ دیا ہے میرے پیش نظر نہیں ممکن ہے اس میں غلطی سے سویدا کے معنی ''خط'' ہی لکھا؟ لیکن یہ لفظ دراصل ''خلط'' ہے کی جمع اخلاط ہے۔ طب کی رو سے یا عند الاطبا جسم انسانی میں چار مادے خون، سودا، صفرا اور بلغم ہیں جنھیں اخلاط اربع کہا جاتا ہے۔ ابرار صاحب نے خلط کو خط سمجھ کر بحث کی ہے۔ اس خلط بحث کے علم کے بعد اور اپنے بیان پر ان کی نظر ثانی سے پہلے اس سلسلہ میں گفتگو کرنا مناسب نہیں ہے۔

نیر مسعود نے غالب کے اشعار کی تشریح میں کیسی کیسی نکتہ آرائیاں کی ہیں اور متن کی تہوں کو ممکن حد تک

کھولنے میں کسی دقیقہ سنجی کا ثبوت دیا ہے اس کی عمدہ مثال درج ذیل شعر کی تشریح میں دیکھی جا سکتی ہے۔

مانع وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے خانۂ مجنونِ صحراگرد بے دروازہ تھا

شرح کا طریقۂ کار یہ ہے کہ پہلے تو قابل ذکر شرحوں کا ماحصل بیان کیا گیا ہے۔ پھر شعری روایت، روزمرہ یا لغت کے اعتبار سے ان شرحوں پر وارد ہونے والے اعتراضات کا جائزہ لے کر متن سے پیدا ہونے والے سوالات کا تفصیلی خاکہ پیش کیا گیا ہے اور اخیر میں شعر کی قابل قبول تعبیر اس طرح پیش کی گئی ہے کہ تمام اشکالات رفع ہو جاتے ہیں اور شعر کے مفہوم کے سلسلے میں شرح صدر ہو جاتا ہے۔ نیر صاحب نے اپنے موقف کی تائید میں جگہ جگہ خود غالب کے کلام یا قدما کے اشعار سے سند پیش کر کے اعتراضات کا تسلی بخش جواب بھی دیا ہے۔ بیدل نے علم شرح کا بنیادی نکتہ بیان کرتے ہوئے بہت پہلے یہ بات کہی تھی کہ کسی شعر کی گرہ خود اسی شاعر کے کسی دوسرے شعر یا پھر دوسرے شعرا کی مدد سے کھلتی ہے غرض دوسرے اشعار کی رہنمائی میں ہی کسی متن کی عقدہ کشائی کا مشکل مرحلہ طے ہوتا ہے۔ ناخن سے لب کشائی کا نازک کام ممکن نہیں۔

گرہ کشائے سخن ور، سخن بود بیدل یہ ناخنے نہ فتد کار لب کشودن ہا (بیدل)

نیر صاحب نے علم شرح کے اس اصول سے بہت سلیقے سے کام لیا ہے۔ شعر زیر مطالعہ میں نیر مسعود نے پہلے تو نظم طباطبائی، حسرت موہانی اور بیخود دہلوی کی شرحیں نقل کی ہیں پھر تینوں شرحوں کے مشترک مفروضے بیان کئے ہیں کہ تینوں شرحوں میں:

1۔ فائز مجنوں سے صحرا اد ہے۔ نظم طباطبائی نے اس کی توجیہ یہ پیش کی ہے کہ شاعر نے مجنوں کی صفت، صحرا گرد قرار دے کر یہ ظاہر کر دیا ہے کہ مجنوں کا گھر صحرا تھا

2۔ دوسرا مفروضہ اس پہلے مفروضے کا نتیجہ ہے کہ مجنوں کے گھر کا دروازہ تھا، پہلا مفروضہ یہ ہے کہ مجنوں کا گھر صحرا تھا لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ شاعر صحرا کو بے دروازہ کہہ رہا ہے۔

3۔ صحرا کو بے دروازہ کہا گیا ہے اور صحرا کی صفت یہ ہے کہ اس کا راستہ کھلا ہوتا ہے۔ اس سے تیسرا مفروضہ خود بخود قائم ہو گیا کہ " بے دروازہ کا مطلب یہ ہے کہ ایسی جگہ جہاں آنے جانے

میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

اس کے بعد نیر صاحب کی سخن فہمی، نکتہ رسی اور متن کی داخلی ساخت میں گہری اتر جانے والی نگاہیں، ان تمام مفروضوں پر ایسا سوالیہ نشان قائم کرتی ہیں کہ معنی کی یکسر قلب ماہیت ہو جاتی ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

''ان تینوں مفروضوں کی مدد سے شعر کا مطلب نکالنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ لیکن دقت یہ ہے کہ تینوں مفروضے غلط بلکہ حقیقت کے برعکس ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ان مفروضوں کے غلط ہونے کی وجوہات بھی متن ہی میں موجود ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

1۔ خانہ اور صحرا ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس لئے صحرا کو مجنوں کا گھر نہیں کہا جا سکتا۔ مجنوں وحشت عشق میں گھر چھوڑ کر آوارہ ہوا اس نے جس جگہ کو ترک کیا وہ تو خانۂ مجنوں تھا اور جہاں اب قیام اختیار کیا وہ صحرا ہے۔

2۔ شعر میں خانۂ مجنوں کو بے دروازہ کہا گیا ہے، صحرا کو نہیں؛

3۔ اور بے دروازہ کا مطلب تو نیر صاحب نے وہ بیان کئے ہیں کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے لکھتے ہیں۔

''بے در اور بے دروازہ کھلی ہوئی جگہ کو نہیں بلکہ ایسی بند جگہ کو کہتے ہیں جس میں داخل ہونے اور اس سے باہر نکلنے کی کوئی راہ نہ ہو۔ انھوں نے مثال میں غالب کا یہ مصرعہ بھی پیش کیا ہے۔

واسطے جس شہ کے غالب، گنبد بے در کھلا

ان بیانات کی روشنی میں شعر کا مفہوم، دیگر شارحین کے بیان کئے ہوئے مفہوم سے بہت آگے نکل جاتا ہے اب شعر زیر مطالعہ کا مطلب یہ ہوا کہ:

1۔ خانۂ مجنوں خود مجنوں کے لیے بے دروازہ تھا کیونکہ پاگل شخص کو گھر کے اندر بند کر کے رکھا جاتا ہے۔ مجنوں پر گھر سے باہر نکلنے کی راہ مسدود تھی۔

2۔ خانۂ مجنوں لیلی کے لیے بھی بے دروازہ تھا اس لیے کہ مجنوں کو گھر میں بند کر کے رکھا گیا تھا اور لیلی اس تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

3۔ خانۂ بے دروازہ کے دونوں مفاہیم کو ذہن میں رکھ کر پہلا مصرعہ پڑھئے تو اب اس پہلے مصرعہ

میں بھی دو مفہوم موجود ہیں اور یہ دونوں مفاہیم پہلے مصرعہ کے دونوں مفاہیم میں پیوست ہو جاتے ہیں۔
پہلا مفہوم تو یہ ہے کہ مجنوں پر تو گھر سے نکلنے کی بندش تھی کیونکہ اس کا گھر تو بے دروازہ تھا جس سے باہر نکلنے کی راہ مسدود تھی لیلی کا گھر تو بے دروازہ نہیں تھا وہ تو اپنے گھر سے نکل سکتی تھی، اس کو کون مانع تھا
اور دوسرا مفہوم یہ کہ اب مجنوں صحرا میں ہے اور وحشت خرامی کا مطلب ہے وحشت عشق میں نکل پڑنا اور ظاہر ہے کہ آدمی اس صورت میں سیدھا صحرا کا رخ کرتا ہے اب شعر کی قرأت میں وحشت خرامی اور ''خانہ'' پر زور دیجئے۔

مانع وحشت خرامی ہائے لیلی کون ہے

یعنی لیلی کے لیے مجنوں کا گھر بے دروازہ تھا جہاں وہ اس تک نہیں پہنچ سکتی تھی لیکن صحرا تو بے دروازہ نہیں۔ لیلیٰ کی وحشت خرامی اس کو صحرا میں مجنوں تک پہنچا سکتی ہے۔ اب لیلی کی وحشت خرامی میں کون سی رکاوٹ ہے۔
نیر صاحب یہیں پر ''بس'' نہیں کرتے بلکہ متن سے برآمد ہونے والے ایک بنیادی سوال کی طرف توجہ کرتے ہیں اور وہ سوال پہلے مصرعہ میں موجود ہے کہ

مانع وحشت خرامی ہائے لیلی کون ہے

یعنی لیلی کی وحشت خرامی کے لئے سارے حالات سازگار ہیں پھر مانع کون ہے؟ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لیلیٰ کی وحشت خرامی عمل میں نہیں آرہی ہے شعر کا استفہام اسی مانع کی تلاش ہے اور اس استفہام کا جواب یہ ہے کہ وحشت خرامی کا محرک جنون عشق ہے۔ مجنوں اس وحشت کے سبب صحرا تک پہنچ گیا، لیلیٰ سے وحشت خرامی عمل میں نہیں آرہی ہے یہی اس بات کا ثبوت بلکہ لیلی یہاں جنون عشق موجود نہیں۔ سوال تھا '' مانع وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے
جواب ہے ''جنون عشق کا موجود نہ ہونا
نیر صاحب یہیں پر نہیں رکتے وہ شعر کے یکسر نئے مفہوم کا امکان یہ ہے کہہ کر پیدا کر دیتے ہیں کہ یہ سوال استفہام محض کے بجائے اگر استفہام انکاری فرض کیا جائے تو سوال کا جواب خود سوال سے

بھی برآمد ہو جاتا ہے اور اس صورت میں جواب یہ ہوگا کہ لیلیٰ کی وحشت خرامی میں کوئی مانع نہیں۔
جب مجنوں اپنے خانہ بے دروازہ سے نکل کر صحرا میں پہنچ سکتا ہے تو بھلا لیلیٰ کو روکنے والا کون
ہے؟ کوئی بھی نہیں ۔وہ بھی صحرا میں آجائے گی۔ اس مفہوم کی تائید میں نیر صاحب غالب کا ایک
دوسرا شعر پیش کرتے ہیں۔

قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دشت قیس میں آنا تعجب ہے وہ بولا، یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں

یہ فقط ایک مثال ہے "تعبیر غالب" میں اشعار پر گفتگو کی۔ نیر مسعود نے غالب کے 16 سولہ
اشعار کی اسی انداز سے شرح کی ہے اور ہر جگہ متن کے اجزا میں ربط کی نوعیت سے برآمد ہونے
والے معانی کو انھوں نے روشن کر دیا ہے۔ فقط 16 سولہ اشعار کی تشریح پر مشتمل 208 صفحات کی
یہ کتاب اگر توجہ سے پڑھ لی جائے تو غالب کے شعری طریقۂ کار سے بڑی حد تک واقفیت ہو جاتی
ہے۔ تعبیر غالب کی خصوصیات کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ:

1۔ اس کتاب کو پڑھ کر یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ غالب نے اپنے مدعا کو عنقا بنانے میں کن
تدابیر سے کام لیا ہے۔

2۔ غالب کے بیشتر اشعار اپنی نہاد اور وضع میں کثرت معانی کے حامل ہیں۔ ان متون میں
پوشیدہ امکانات کو انتہائی درجے تک دریافت کرنا بہت دشوار ہے۔

3۔ نیر مسعود کی تشریح کا انداز عالمانہ مگر اسلوب سادہ اور سلیس ہے۔

4۔ نیر مسعود نے فارسی شاعری کی روایت خصوصاً سبک ہندی کے پس منظر میں غالب کے
اردو کلام کی گرہوں کو کھولنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

5۔ تعبیر غالب کے مطالعہ کے بعد خیال ہوتا ہے کہ ان اشعار کے علاوہ غالب کے دوسرے
شعروں میں بھی معانی کے مزید امکانات ہنوز دریافت طلب ہیں

6۔ اور آخری بات یہ کہ غالب کے اداشجوں کی مختصر فہرست میں بھی نیر مسعود کا نام بہت نمایاں ہے۔

ڈاکٹر خالد جاوید

غالب اور جدید فکر

غالب اور جدید فکر کے تعلق سے یا غالب کی جدید ذہن سے نسبت کے حوالے سے اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اس میں کسی قسم کا اضافہ کرنا یا کسی نئی جہت کا دریافت کرنا بہت مشکل ہے، پھر بھی ادب اور سماجی علوم میں بعض باتوں پر نظر ثانی کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے اس مقالے کا مقصد بھی بس یہی ہے۔

جدید فکر کی ماہیت ہمیشہ انفرادی نوعیت کی ہوتی ہے۔ وجودیت، مادیت، انسان دوستی اور تشکیک جدید فکر کے نمائندہ رجحانات ہیں مگر ان تمام رجحانات کو فرد سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ جب فرد انفرادی اعتبار سے فعال ہوجاتا ہے اور ایک نئی سطح پر ایک زیادہ وسیع کائنات سے خود کو وابستہ محسوس کرنے لگتا ہے تو وجودیت اور مادیت بھی ایک ہوجاتے ہیں۔ ہربرٹ ریڈ نے کہا تھا کہ ایک سچا مارکسی ہونے کے لیے وجودی ہونا ضروری ہے لہٰذا غالب جسے اب ہر کوئی انفرادی فکر کا شاعر تسلیم کر چکا ہے، اسے ایسی سہل پسندی کے لئے تختۂ مشق نہیں بنانا چاہئے کہ اگر اس کی شاعری میں وجودیت کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں تو وہ تصوف کی کسی روایت سے تو رسمی طور پر منسلک ہوسکتا ہے مگر مادیت سے نہیں یا یہ کہ اگر غالب کے ہاں تشکیک اور سوال قائم کرنے کا ایک مستقل رجحان نظر آتا ہے تو پھر وہ وجودی نہیں ہوسکتا کہ وجودی ہونے کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ فرد کو اپنے ہونے کا عرفان حاصل ہوجائے جس کے بعد کسی قسم کی تشکیک غیر ضروری ہی کہی جا سکتی ہے۔

مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ غالب کوئی مفکر نہیں تھے۔ وہ صرف ایک شاعر تھے۔ ایک شاعری فکر اور ایک مفکر کی فکر میں بہت فرق ہوتا ہے۔ مفکر کو بہرحال ایک رسمی سے ڈسپلن کا ہمیشہ

پابند رہنا پڑتا ہے۔ ڈسپلن کا کام پردے اٹھانا نہیں بلکہ پردے داری ہے۔ مفکر کی فکر کو اکثر سیاست ہائی جیک کر لیتی ہے پھر یہ پردے ironcurtain میں بدل جاتے ہیں اور ہمیں یہ بہت مشکل سے معلوم ہو پاتا ہے کہ مارکس کو شیکسپیئر کے ڈرامے یا بالزاک کے ناول کس درجہ پسند نہیں تھے۔

اس کے برخلاف شاعری کی فکر آوارہ ہوتی ہے۔ بھٹکتے رہنا ہی اس کا مقدر ہوتا ہے۔ سچے شاعر کو ہمیشہ اپنے جذبے اور احساس پر ہی اکتفا کرنا ہوتا ہے اس کی اگر کوئی فکر ہوتی ہے تو وہ جذبے اور احساس کے بطن سے ہی برآمد ہوتی ہے۔ غالب کی شاعری میں فکر کی جتنی بھی جہات ہیں، انھیں اس نکتے پر توجہ دیے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔

غالب پر لکھے اپنے دو گذشتہ مضامین میں راقم الحروف نے بار بار اس امر پر زور دیا ہے کہ غالب کی شاعری کی ساری قوت ان کی وجودیت میں پنہاں ہے۔ یہ شاعری وجود کے کرب کی داستان ہے۔ وجودی تجربہ سرکس میں دکھائے جانے والے کرتب سے مختلف ہے جس پر خوش ہو کر نہ صرف تماشائی تالیاں بجاتے ہیں بلکہ خود وہ کرتب دکھانے والے بھی مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ وجودی تجربہ ہمیشہ اضطراب، اداسی اور افسردگی کے خول میں بند رہتا ہے۔ یہ اس افسردہ سی رومانویت سے مختلف ہے جو بالآخر سستے پن میں تبدیل ہو کر اپنا اعتبار کھو دیتی ہے۔

دراصل غالب کا سروکار اپنی ذات کے ساتھ تھا۔ مکالمہ تو غالب نے صرف اپنے آپ سے یا اپنی روح کے ساتھ کیا۔ ہاں کبھی غالب اور غالب کی ذات کے درمیان ایک جھوٹی کائنات، بھیانک تماشے کی صورت بن کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ اس کائنات کو غالب نے ہمیشہ دھتکارا، ان کی اس دھتکار نے انکی شاعری میں وہ تمام عناصر پیدا کر دیے تھے جن کا تعلق جدید فکر سے ہے۔ حالانکہ وجودیت بطور ایک فلسفے یا رجحان کی صورت میں پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد کی پیداوار ہے مگر غالب کے یہاں اپنی ذات کا عرفان اسی انداز میں ہوا اور شاعری میں اس کا اظہار اس طرح ہوا کہ وہ ساری لغویت جو بقول بیسویں صدی کے وجودی مفکروں کے دنیا میں جاری و ساری ہے۔ غالب کی شاعری کا سب سے بڑا امتیاز قرار پائی۔ غالب کا جدید فکر سے اگر کوئی تعلق ہے تو ان کی اسی وجودی شناخت کی بنا پر ہے۔ غالب نے کائنات کی اس لغویت، یا جبر کے خلاف وجودی بغاوت کی جس کے سبب ان کی شاعری میں انسان دوستی، روشن خیالی

پابند رہنا پڑتا ہے۔ ڈسپلن کا کام پردے اٹھانا نہیں بلکہ پردے داری ہے۔ مفکر کی فکر کو اکثر سیاست ہائی جیک کر لیتی ہے پھر یہ پردے ironcurtain میں بدل جاتے ہیں اور ہمیں یہ بہت مشکل سے معلوم ہو پاتا ہے کہ مارکس کو شیکسپیئر کے ڈرامے یا بالزاک کے ناول کس درجہ پسند تھے۔

اس کے برخلاف شاعری کی فکر آوارہ ہوتی ہے۔ بھٹکتے رہنا ہی اس کا مقدر ہوتا ہے۔ سچے شاعر کو ہمیشہ اپنے جذبے اور احساس پر ہی اکتفا کرنا ہوتا ہے اس کی اگر کوئی فکر ہوتی ہے تو وہ جذبے اور احساس کے بطن سے ہی برآمد ہوتی ہے۔ غالب کی شاعری میں فکر کی جتنی بھی جہات ہیں، انھیں اس نکتے پر توجہ دیے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔

غالب پر لکھے اپنے دو گذشتہ مضامین میں راقم الحروف نے بار بار اس امر پر زور دیا ہے کہ غالب کی شاعری کی ساری قوت ان کی وجودیت میں پنہاں ہے۔ یہ شاعری وجود کے کرب کی داستان ہے۔ وجودی تجربہ سرکس میں دکھائے جانے والے کرتب سے مختلف ہے جس پر خوش ہو کر نہ صرف تماشائی تالیاں بجاتے ہیں بلکہ خود وہ کرتب دکھانے والے بھی مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ وجودی تجربہ ہمیشہ اضطراب، اداسی اور افسردگی کے خول میں بند رہتا ہے۔ یہ اس افسردہ سی رومانویت سے مختلف ہے جو بالآخر سستے پن میں تبدیل ہو کر اپنا اعتبار کھو دیتی ہے۔

دراصل غالب کا سروکار اپنی ذات کے ساتھ تھا۔ مکالمہ تو غالب نے صرف اپنے آپ سے یا اپنی روح کے ساتھ کیا۔ ہاں کبھی غالب اور غالب کی ذات کے درمیان ایک جھوٹی کائنات، بھیانک تماشے کی صورت بن کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ اس کائنات کو غالب نے ہمیشہ دھتکارا، ان کی اس دھتکار نے انکی شاعری میں وہ تمام عناصر پیدا کر دیے تھے جن کا تعلق جدید فکر سے ہے۔ حالانکہ وجودیت بطور ایک فلسفے یا رجحان کی صورت میں پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد کی پیداوار ہے مگر غالب کے یہاں اپنی ذات کا عرفان اسی انداز میں ہوا اور شاعری میں اس کا اظہار اس طرح ہوا کہ وہ ساری لغویت جو بقول بیسویں صدی کے وجودی مفکروں کے دنیا میں جاری وساری ہے۔ غالب کی شاعری کا سب سے بڑا امتیاز قرار پائی۔ غالب کا جدید فکر سے اگر کوئی تعلق ہے تو ان کی اسی وجودی شناخت کی بنا پر ہے۔ غالب نے کائنات کی اس لغویت، یا جبر کے خلاف وجودی بغاوت کی جس کے سبب ان کی شاعری میں انسان دوستی، روشن خیالی

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت
پھر ایک روز مرنا ہے حضرت سلامت
اے عافیت کنارہ کر، اے انتظام چل
سیلاب گریہ در پئے دیوار و در ہے آج
چھوڑوں گا میں نہ اس بت کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو، مجھے کافر کہا کرے
چھوڑے نہ خلق گو، مجھے کافر کہے بغیر
سر پھوڑنا وہ، غالب شوریدہ حال کا
یاد آ گیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

ان اشعار میں وجودیت اور ایک لطیف قسم کا Materialism آپس میں اس طرح پیوست ہوگئے ہیں کہ اشعار میں معنی کی بہت سی پرتیں روشن ہونے لگتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ غالب اپنی تنہائی میں بلکہ کہنا چاہئے کہ اپنے وجود کی تنہائی میں خود سے باتیں کرتے رہتے ہیں۔ ان خود کلامیوں کا آہنگ کبھی کبھی بلند بھی ہوجاتا ہے۔ غالب کے یہاں جو استفہامیہ لہجے یا تشکیک کی بات بہت کی جاتی ہے مجھے اسی سے جزء اختلاف ہے۔ یہ صرف ان کے خود سے بات کرنے کا انداز ہے۔ محض کسی فقرے میں سوالیہ لہجے کا آجانا اس بات کی دلیل کہاں ہے کہ جملے میں واقعتاً کوئی سوال قائم بھی کیا جارہا ہے۔

سرل کی Theory of speech act میں ان مسائل پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ غالب شاعر ہیں ان کے یہاں ایسا کوئی سوال قائم نہیں ہوتا جس کا جواب پیشہ ور عالم نہ دے سکیں۔ مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھئے۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آتے ہیں — ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے؟

کیا غالب حقیقتاً اتنے ہی معصوم ہیں کہ وہ ان سوالوں کے جواب نہیں جانتے یا پھر انھیں عالموں کے یا مفکروں کے نظریات سے مکمل ناواقفیت ہے؟ میرا خیال ہے کہ یہ اور اسی طرح کے بہت سے اشعار صرف ان

کی خود کلامیاں ہیں۔ یہ خود کلامیاں ایک گہری وجودی فکر، واضح رہے کہ مفکر کی نہیں بلکہ ایک شاعر کی وجودی فکر کے بغیر نہیں پیدا ہو سکتیں۔ غالب اپنی ذات، دوسرے انسانوں کی ذات جو ان کے لئے جاندار اشیاء کی حیثیت رکھتی ہے، بے جان اشیاء اور قادرِ مطلق کے درمیان کوئی رشتہ کوئی equation تلاش کر رہے ہیں۔ مگر اس رشتے کو وہ دوسرے کے سر نہیں تھوپ رہے ہیں بلکہ وہ اپنی ہی ذات کی جانچ پڑتال کر رہے ہیں۔ تقریباً ایک primitive انسان کی طرح جس کی حیرت اور جس کی تجسس نے سب سے پہلے خود اس کی روح میں ایک کھڑکی پیدا کی تھی اسی طرح primitive اور ماڈرن میں ایک رشتہ قائم ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ چلا آتا ہے۔ ماڈرن اپنے تجریدی میں مراحل میں primitive ہو جاتا ہے اور primitive یا متھ اپنی ذات کا عرفان حاصل کر کے modern بن جاتا ہے۔

غالب کی شاعری میں یہ جو مشکل پسندی کی بات کی جاتی رہی وہ بھی ان کی شاعرانہ فکر کی تجریدیت کے باعث ہی ہے۔ دراصل ٹھوس اور تجریدی میں کوئی تضاد کا رشتہ نہیں ہے۔ غالب اس نکتے سے بخوبی واقف تھے۔ اسے محض خیال کی شاعری کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا۔ آج کی سائنس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ matter کس طرح Antimatter میں بدل جاتا ہے۔ کائنات کے بڑے بڑے انکشافات صرف Alstractions کے ذریعے ہی ہوتے ہیں۔ کسی بھی قسم کی تجرید ایسی نہیں ہے جسے ٹھوس شکل نہ دی جائے اور کوئی ٹھوس شے ایسی نہیں ہے کہ جسے تجربہ میں نہ بدلا جائے۔ اس کو مشکل ہونا کہہ دیا جاتا ہے۔ امریکہ کے جدید شاعر رابرٹ پنسکی نے کہا ہے کہ ”شاعری کے space میں چند جواچھے مقامات ہیں، ان میں سے ایک مشکل ہونا بھی ہے، کسی بھی مشکل شے میں اک مقناطیسی کشش ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ریاضی میں cross word puzzles میں یا بعض ویڈیو گیمز میں۔ شاعری کوئی عوامی پیشاب خانہ نہیں ہے کہ اگر اسے بنوایا جاتا ہے تو پھر یہ مانگ بھی فطری ہو جاتی ہے کہ اس میں ہر شخص آسانی سے آجائے۔ شاعری کے تقاضے شہری حقوق کو فنِ تعمیر سے مختلف ہوتے ہیں۔“

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ غالب کی شاعرانہ فکر کی وجودی تجربے نے جلابخشی ہے میں اپنے گذشتہ دو مضامین میں غالب اور وجودیت کے تعلق سے تفصیلی گفتگو کر چکا ہوں اور سردست یہ ممکن نہیں کہ میں ان باتوں کو دہراؤں اور نہ ہی اس کی کوئی ضرورت ہے مگر اس نکتے پر زور دینا بہرحال یہاں ضروری ہے کہ

غالب کی وجودیت کے حوالے سے ہی جدید فکر سے ان کا کوئی تعلق قائم کیا جا سکتا ہے ورنہ ان کے اشعار میں اس قسم کے جو مضامین دہرائے گئے ہیں ان کی نوعیت محض طبع آزمائی ہی بن کر رہ جائے گی۔

وجودی فکر کی ماہیت ہی ایسی ہوتی ہے کہ اسے کسی بنے بنائے سانچے میں فٹ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر سارتر کے ناول ''ناسیا'' یا The age of reason پڑھ کر ہمیں جس تخلیقی تجربے، بصیرت اور وجود کے شعر کا انوکھا احساس ہوتا ہے وہ سارتر کی کتاب Being and Nothingness پڑھ کر نہیں ہوتا کیونکہ وہاں سارتر نے بطور ایک تخلیقی فنکار یا ناول نگار کے بجائے ایک فلسفی یا مفکر کی حیثیت سے اپنے نظریات کو ایک سانچے میں فٹ کرنے، اکیڈمک ڈسپلین دینے یا تھیوری پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

غالب کا جدید فکر سے کوئی رشتہ اس بنیاد پر قائم نہیں کیا جا سکتا کہ وہ باقاعدہ کسی تھیوری، نظریے یا انسان کے جدید رویوں سے متعلق کوئی آئیڈیالوجی تشکیل کر رہے تھے، یہ کام مذہبی پس منظر میں اقبال کی شاعری نے کیا ہے۔ اقبال کا بھی بہرحال ایک رشتہ وجودیت سے ہمیشہ ہی قائم رہا۔ مگر غالب کی بات دوسری تھی۔ اسی کے وجودی تجربے نے اسے کائنات، خدا اور مادہ سب سے الجھنا سکھایا۔ اپنے وجود کے عرفان نے اسے یہ بصیرت بخشی کہ وہ اپنی شاعری کو ایک وجودی امکان کی طرح ہر پل ایک نیا مقام دے پانے میں کامیاب ہو سکا۔ وہ اپنی خدمت کے حوالے سے ہی خدا، مادہ اور کائنات سب سے ٹکرائے اور جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی شاعری ان کی ایسی خود کلامیاں بن گئیں جن کی گونج میں اور جن کی tone میں انسانی نظام نشانات کی نارسائی کا اظہار ہوا جو ایک بے حد جدید اور پے چیدہ ذہنی ساخت کا سراغ دیتی ہیں۔ غالب کے اشعار میں شوخی اور ظرافت کا ذکر بھی کیا جاتا رہا ہے۔ مگر ان کی یہ نام نہاد شوخی یا مزاح بھی پنچایتی نوعیت کی نہ ہو کر خالص انفرادی نوعیت کی ہے اور یہ بھی ان کی خود کلامیاں ہیں جن کی افسردہ Tone صاحب بصیرت قاری کی نظر سے چھپی نہیں رہ سکتیں۔ اس ضمن میں وزیر آغا کا ایک اقتباس پیش کرنا بے محل نہ ہوگا۔ وزیر آغا اپنے مضمون ''غالب ایک جدید شاعر'' میں لکھتے ہیں ''غالب کے یہاں مزاح کی وہ منفرد روش ابھری ہے جو فرد کی ہنسی۔............

.... Individual Laugther سے منسلک ہے نہ کہ گروہ کی ہنسی۔............

.... Choral Laugther سے ..... جدید دور میں فرد کی انفرادیت کے نمایاں

ہونے کے ساتھ ساتھ ہنسی کی وہ منفرد کیفیت ابھر آئی ہے جو فردی امیج اور آزاد روی سے تحریک پاتی ہے۔ چنانچہ فردی ہنسی میں بلند بانگ لہجے کے بجائے ایک زیرِ لب تبسم کی کیفیت ابھری ہے جو بجائے خود ایک تہذیبی عمل ہے۔ غالب اس اعتبار سے اردو کے غزل گو شعرا میں منفرد ہے کہ اس کے اشعار میں جو تبسم ابھرا ہے وہ آنسو کی ایک زیریں لہر میں گھل مل سا گیا ہے۔"

غالب کی فکر کی اس آزادہ روی کو مندرجہ ذیل اشعار میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ع

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی، وہ میرا آشیاں کیوں ہو؟

غالب بھی گر نہ ہو، تو کچھ ایسا ضرر نہیں
دنیا ہو یارب! اور مرا بادشاہ ہو

علاوہ عید کے، ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں، جو وہ لکھیں گے جواب میں

ایک شرر دل میں ہے، اس سے کوئی گھبرائے گا کیا
آگ مطلوب ہے ہم کو، جو ہوا کہتے ہیں

داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی، واہ واہ
یاد کرتا ہے مجھے، دیکھے ہے وہ جس جا نمک

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

ان اشعار میں وجودیت، مادیت، انسان دوستی اور مزاح آپس میں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ کسی ایک رجحان کی شناخت کر پانا آسان کام نہیں۔ مگر بنیادی چیز اپنے ہونے کا شعور ہے جس کے حوالے سے ہی غالب اپنی ذات کے ساتھ یہ مکالمے قائم کرتے ہیں اور ہم انھیں جدید ذہن اور جدید رویے کے بہت قریب محسوس کرتے ہیں۔ یہاں یہ ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ غالب کے خطوط سے بھی ان کی شخصیت کے ایسے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے جو انھیں جدید فکر سے منسلک کرتے ہیں مگر اس مقالے کو غالب کی شاعری تک ہی محدود رکھا گیا ہے۔ خطوطِ غالب کے حوالے سے یہ موضوع ایک الگ مقالے کا متقاضی ہے جسے میں کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔

☆☆☆

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

غالبؔ کی معنویت عصرِ حاضر میں

ہر دور اپنے کچھ تقاضے رکھتا ہے، اور اگر کسی عہد، کسی زمانے اور کسی دور کے اپنے کچھ تقاضے نہ ہوں تو اس دور کی شناخت بھی ممکن نہیں ہو سکتی۔ شناخت ان فیچرس (Features) کی بدولت ہوتی ہے، جو ایک زمانے کو دوسرے زمانے سے ممتاز کرتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے ایک انسان کے اپنے خدوخال اور چہرے کے نقش و نگار، دوسرے آدمی سے مختلف ہوتے ہیں، اور اسے چہرے مہرے کے اعتبار سے، دوسرے اسی جیسے انسانوں سے الگ کرتے ہیں، اسی طرح دور بھی الگ الگ ہو جاتے ہیں۔

وقت لمحوں کا تسلسل ہے۔ کوئی لمحہ نہ ٹھہر سکتا ہے، نہ رُک سکتا ہے۔ اس کا سفر جاری رہتا ہے اور اس کے باجود ایک عمر دوسری عمر سے اور ایک زمانہ دوسرے زمانے سے اور ایک زندگی دوسری زندگی سے الگ ہو جاتی ہے، اور جو معنی اور معنویت کا فرق ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ لفظ اپنے معنی کو بدل دیتے ہیں، نئے معنی اختیار کر لیتے ہیں، اسی طرح ایک دور کے بعد کسی بھی فنکار، کسی بھی فلسفے اور کسی بھی نقطۂ نظر کا پس منظر اور طریقِ رسائی (approach) دوسرے دَور سے مختلف ہو جاتی ہے اور ہم اب صرف اس کے معنی کو دریافت نہیں کرتے، بلکہ meaning کے اس رخ کو دریافت کرنا چاہتے ہیں جسے Meaning of the Meaning کہہ سکتے ہیں۔ یہی اس کی معنویت ہے، Relevence ہے کہ وہ آج ہمارے لیے کیا ہے، اس کے دَور نے اسے کیا سمجھا، یہ بھی ایک بات ہے، بڑی بات ہے، لیکن ہم اسے کیا سمجھ رہے ہیں، کس طرح سمجھ رہے ہیں اور کیوں سمجھ رہے ہیں، یہ اس نقطۂ نظر، اس فلسفۂ فکر اور اس فنی

approach کی وہ معنویت ہے جو ہمارے دور کے لیے ہے، جو اس دَور سے مختلف ہے، جس میں کوئی شاعر، کوئی فنکار یا کوئی فلسفہ سانس لے رہا تھا۔

غالبؔ انیسویں صدی کے نصفِ اول سے تعلق رکھنے والے ایک بڑے شاعر، ادیب، نثر نگار اور بہ حیثیت مجموعی فنکار تھے۔ ان کے دَور میں بھی ان کی قدر و منزلت ہوئی، وہ دہلی کے چند بڑے شاعروں میں تھے، دہلی اس وقت اگرچہ مغلوں کے دورِ زوال کا ایک عبرت انگیز نشان تھا، مغل بادشاہت کا صرف نام باقی رہ گیا تھا اور بادشاہ جو قلعے میں رہتا تھا، سچ پوچھیے تو اس کی حکومت قلعے میں بھی نہیں تھی۔ وہ پہلے مرہٹوں کا وظیفہ خوار تھا اور ۱۸۰۳ء میں دہلی اور آگرے پر انگریزوں کے قبضے کے بعد اب انگریز کمپنی بہادر کی پناہ میں آ گیا تھا۔

شاہ عالم ثانی، جن کی وفات ۱۸۰۶ء میں ہوئی تھی، ان کے بعد اکبر شاہ ثانی جو ۱۸۳۷ء تک قلعے میں برائے نام بادشاہ رہے اور ان کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد بہادر شاہ ظفر اپنی grown-up age میں بادشاہ بنے اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں یہ برائے نام حکومت بھی ختم ہوگئی۔ بادشاہ گرفتار ہوگئے۔ ان پر مقدمہ چلا اور رنگون بھیج دیے گئے اور وہاں سے مانڈلے (برما) میں منتقل ہوگئے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔

غالبؔ نے اسی زمانے کی دلّی میں اپنا وقت گزارا۔ ان کی پیدائش آگرے میں ہوئی تھی۔ بارہ تیرہ برس کی عمر میں ان کی شادی ہوگئی، اور کچھ زمانے کے بعد وہ دلّی آگئے۔ انگریزی کمپنی بہادر کی طرف سے ساڑھے باسٹھ روپے ماہوار ان کو وظیفہ ملتا تھا۔ وہ نواب الٰہی بخش خاں معروف کے چھوٹے داماد تھے۔ نواب صاحب خود دہلی کے رئیس زادوں میں تھے، اور نواب احمد بخش کے چھوٹے بھائی تھے۔

دلّی میں رہتے ہوئے غالبؔ نے ایک ادیب، ایک شاعر اور ایک نثر نگار کی حیثیت سے بہت ترقی کی۔ وہ کسی ضلع جاگیر کے مالک تو نہ بنے، ہمیشہ کرائے کے مکان میں رہے، لیکن اپنی ذہانت اور اپنی شاعرانہ صلاحیت کے اعتبار سے اپنے عزیزوں، دوستوں اور ملنے والوں کے درمیان بہت عزت اور وقار کے ساتھ رہے۔ یہ بھی ہمارے لیے غالبؔ کی ایک معنویت ہے کہ آدمی اگر ایک اعتبار سے کمزور ہو تو دوسرے لحاظ سے وہ اتنا نمایاں ہوسکتا ہے

اور اتنی عزت اور شہرت پا سکتا ہے کہ اچھے اچھوں کو اس پر رشک آئے۔ مگر اس کے لیے اسے اپنے اندر چھپی ہوئی دوسری صلاحیتوں سے کام لینا ہوتا ہے، اور انھیں دریافت کرنا ہوتا ہے۔ اس طرح سے انسانوں کی زندگیاں دوسروں کے لیے چراغِ راہ بن جاتی ہیں، اور آگے آنے والی نسلیں ان سے روشنی اور رہنمائی حاصل کر سکتی ہیں۔

آخر سب کے سب دولت مند نہیں ہوتے۔ ہر ایک کو ترقی کرنے اور اپنی شناخت بنانے کا موقع بھی خاندانی ورثے کے طور پر نہیں ملتا۔ اس کے لیے آدمی کو خود ہی فکری اور عملی جدوجہد کرنی ہوتی ہے۔ یہ جدوجہد اور صلاحیتوں کا یہ استعمال ہمیں غالبؔ کی زندگی میں بھی ملتا ہے، اور ہم اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ غالبؔ نے جو کچھ کیا اور جس طرح کیا اور جتنا کیا۔ اس کے خوب و ناخوب کو سمجھنا، اسی طرح ایک اہم بات ہے جس طرح تاریخ کے علم و عمل کو سمجھنا، اس لیے کہ تاریخ، عمل اور ردِ عمل، نیز نتیجۂ عمل کا ایک ایسا ریکارڈ ہے جس سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

اگر دیکھا جائے تو تاریخ ہمارے دَور کی ہو یا پچھلے دَور کی، یا کسی ملک کی، وہ انسانی زندگی ذہن اور زمانے پر اپنے اثرات ڈالتی ہے اور اپنے بعد اپنی پرچھائیاں چھوڑ جاتی ہے اور یہ زیادہ تر بڑی شخصیتوں کا عمل ہوتا ہے جو کسی بھی اعتبار سے بڑی ہوں اور کسی بھی نقطۂ نظر سے ان میں بڑائی، اچھائی یا کسی بُرائی کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔

غالبؔ نے اپنے زمانے سے بہت کچھ لیا۔ ان دوستوں سے جن میں سے ہر ایک اپنے زمانے کا ایک بہت نمایاں فرد تھا، قابلِ احترام شخص تھا۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہؔ، نواب ضیاء الدین احمد خاں نیرؔ، نواب علاء الدین احمد خاں علائیؔ، مفتی صدر الدین آزردہ، مولانا فضل حق خیر آبادی اور دہلی کے دوسرے اکابر، جس میں ان کے ہم زمانہ شعراء بھی شامل تھے۔ بہادر شاہ ظفر بہ حیثیت انسان بہت اچھے، اور قابلِ قدر آدمی تھے اور اہلِ فن کی بڑی قدر کرتے تھے۔ غالبؔ کی بھی انھوں نے اپنے حالات اور حیثیت کے مطابق ایک شاعر، ایک ادیب اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے ایک شخص کے طور پر بہت عزت کی۔ انھیں خطاب دیا، خلعت سے نوازا اور ان کا وظیفہ مقرر کیا۔

غالبؔ نے ان کے لیے جو کچھ لکھا، وہ اس اعتبار سے بے حد اہم بات تھی کہ وہ بادشاہ کے لیے نہیں، ایک روایت کے احترام کے طور پر بہادر شاہ کو اپنے سامنے رکھ کر قصیدے لکھ رہے تھے، جو بے حد اہم قصیدے ہیں اور جن کو محض انعام و اکرام کے پیمانے سے نہیں ناپا جاسکتا۔ انعام و اکرام کی حیثیت ثانوی تھی، اور اپنی صلاحیتوں کا اظہار آج کے نقطۂ نظر سے زیادہ اہم بات تھی۔

غالبؔ کی معنویت اسی اعتبار سے ہے کہ جو کچھ انھوں نے سوچا، جو کچھ کہا اور جتنا بھی کچھ ان کی زبان قلم سے ہم تک پہنچا وہ اس دور کی فکر کو بھجنے اور اس کی علمی روایت کو پرکھنے میں ہماری بڑی مدد کرتا ہے۔ آخر اس دور میں بڑے عالم تھے، بڑے طبیب تھے اور سادہ کاری کے اعتبار سے بڑے فنکار بھی موجود تھے۔ ان سب کا اثر غالبؔ کی ذہنی زندگی اور فنی رسائیوں پر مرتب ہوا اور آج ہمارے لیے غالبؔ کی تحریروں سے اس گزر جانے والے دور کا مطالعہ غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔

غالب نے اپنے زمانے کی عام روش کو پسند نہیں کیا اور نئے طرز فکر کو اپنایا۔ زبان میں نئی تہہ داری اور نئی معنی آفرینی کو اپنانے کی کوشش کی۔ نئے استعارے، نئی تشبیہیں اور نئی علامتیں ان کے اشعار کی زینت بنے۔ اس پر اپنی فکر کو مبذول کیا، اس میں وہ ایک حد تک مقبول بھی رہے مگر اسی روشِ خاص پر چل کر انھوں نے اپنے لیے نئی راہ بھی نکالی اور وہ صورت پیدا ہوئی۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آئے

یہ طلسم بندی اس وقت کے لوگوں کو زیادہ پسند نہیں تھی۔ وہ عام بول چال کی زبان اور محاورہ بندی کو پسند کرتے تھے۔ اسی کی مشاعروں میں داد ملتی تھی، اور محفلوں میں قدر کی جاتی تھی۔ غالب پر تو یہ پھبتی کسی گئی تھی۔

کلامِ میر سمجھے اور کلامِ میرزا سمجھے
مگر اپنا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اس کے جواب میں انھوں نے یہ کہا تھا ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

انھوں نے اپنے مخلص دوستوں کا مشورہ بھی اپنے بارے میں قبول کیا اور اپنے کلام کا انتخاب بھی کیا۔ اس کا اقرار بھی کیا کہ وہ کافی دنوں تک مضامینِ خیالی لکھتے رہے اور پھر انتخاب کر کے بہت سے شعروں کو اپنے دیوان سے خارج بھی کر دیا۔ اگر دیکھا جائے تو ان کی یہ دونوں تینوں باتیں ہمارے لیے آج بھی لائقِ تعریف اور قابلِ تحسین ہیں۔

غالبؔ نے بہت آزادانہ زندگی گزاری۔ مقروض بھی رہے اور قرض خواہوں سے پریشان بھی، مگر اپنی زندگی، اپنی ہوس اور نشاطِ کار سے متعلق بھی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ دوسروں کی نگاہوں سے ان کو چھپاتے رہے ہوں۔ آدمی کے کردار کی یہ شفافیت بھی اپنے طور پر قابلِ غور اور خیال انگیز ہے کہ وہ کردار کا ایک "کھرا" انسان ہو۔ وہ غمناک بھی ہوتے ہیں، اپنے آلام سے پریشان بھی، لیکن اپنے غموں پر مسکراتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہوئے نظر آتے ہیں ؎

کیوں گردشِ مُدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

لیکن خود ہی یہ بھی کہتے ہیں ؎

تاب لاتے ہی بنے گی غالبؔ
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

انھوں نے شراب نوشی کو بھی اپنے لیے خیال انگیزی اور فکر آفرینی کا ذریعہ بنایا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ خیامؔ اور حافظؔ کی طرح ان کی مے نوشی بھی ہمارے لیے بہت بامعنی ہے۔ ایک شعر میں ساقی سے کچھ نہ کہنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے اس حقیقت کو سامنے لاتے ہیں ؎

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

یعنی میں ساقی سے کہہ نہیں سکتا۔ مجھے اس میں شرم محسوس ہوتی ہے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ میں تو اس پر بھی خوش ہو جاؤں گا کہ مجھے جامِ شراب کی تلچھٹ ہی مل جائے، آدمی ہمیشہ بڑی بڑی باتوں کا طلب گار ہو، یہ ممکن نہیں کہ وہ سب باتیں اسے میسر آ جائیں اور وہ سب خوشیاں اس کا مقسوم بن جائیں۔ کبھی کبھی تو ہمیں کم سے کم پر بھی قناعت کرنی ہوتی ہے اور اسی پر خوش ہو جانا اپنے آپ کو ذہنی طور پر سمجھانے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی آدمی کا اپنا کردار ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ چاہتا ہے اور اپنے فکر و خیال کے اعتبار سے، اپنے ذہن و زندگی کے پیمانوں کو بلند سے بلند رکھنا چاہتا ہے، جہاں ہر ایک کا ہاتھ نہ پہنچ سکے۔

ہمیں غالبؔ کے یہاں ایسے شعر بھی مل جائیں گے جو انؔ کے اس شعور زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں ۔

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں شرم آ پڑی ہے کہ تکرار کیا کریں

یا

منظر ایک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

یہاں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ خیال آرائی ہے، فکر پیمائی ہے، مگر ہم یہ کبھی بھول نہیں سکتے کہ فلسفہ اور شعر و شعور، خیال آرائی ہی کا حصہ ہوتے ہیں۔ جذبہ تخلیقی حسیت کے سانچے میں ڈھل کر ہی بلندیوں کو چھوتا ہے، ان بلندیوں کو جہاں ہر ایک ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ ہم جہاں حقیقتوں کا انکار نہیں کر سکتے، وہاں ذہن کی اس پرواز سے کسی طرح صَرفِ نظر بھی ممکن نہیں۔

انسان اپنے خیالات اور اپنے سوالات کے ذریعے آگے بڑھا ہے اور ان بلندیوں کو اس نے طے کیا ہے جو ایک وقت میں اس کا حصہ نہیں تھیں۔ بعد میں ادوار گزرنے کے اور زمانہ بیت جانے کے بعد کوئی ایسا شخص پیدا ہوتا ہے جو ہماری سوچ کو بدل دیتا ہے۔ غالبؔ بھی شعر و شعور کے دائرے میں ایک ایسی ہی شخصیت تھے جس نے ہمیں آنے والے زمانے کے لیے نئی سوچ دی، نئی نظر بخشی۔ انھوں نے جو نئے سوالات اٹھائے اور جو فکر کے نئے

گوشے ان کی ذہنی سطح پر ابھرے، وہ ہمارے معاشرے کے نہایت اہم مسائل سے جڑے ہوئے ہیں۔ ایک شعر میں کہتے ہیں:

ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

ہماری سماجی نفسیات کے اعتبار سے یہ اہم مسئلہ ہے۔ تکلیف دہ مسئلہ، کہ جو اچھے ہوتے ہیں، ہم ان کو بُرا سمجھتے ہیں، اگر اچھوں کو بُرا کہا جائے گا اور معاشرہ انھیں Condemn کرتا رہے گا تو پھر اچھے لوگ کہاں سے آئیں گے اور اپنے کردار میں اچھائیاں اور سچائیاں پیدا کرنے کی کوشش کون کرے گا، کیوں کرے گا اور کیسے کرے گا۔

اسی سلسلے میں ایک دوسری اہم بات انھوں نے یہ کہی ہے کہ ایسا کون ہوسکتا ہے جسے سب اچھا کہیں۔ یہ بھی بنیادی بات ہے۔ ایک انسان کچھ اعتبارات ہی سے اچھا ہوتا ہے، ہر اعتبار سے نہیں۔ اگر دوسروں کی نگاہِ اعتبار بدل جائے گی تو اس کی پسندیدگی کا پیمانہ کچھ اور ہوجائے گا، اور اس خاص شخص کو وہ تو پسند نہیں کریں گے جن کا پیمانہ اعتبار دوسرا ہوگا۔

ہم انسانوں کا ایک عام عیب یہ ہے، بہت بڑی کمزوری، کہ ہم روایت میں پناہ لیتے ہیں، اور اپنے ذہن کو نئے انداز پر سوچنے نہیں دیتے۔ غالب نے اسے ذوق و شوق کی واماندگی کہا ہے، جس کے معنی ہیں تھک جانے کی وجہ سے پیچھے رہ جانا۔ انسان ایسی ہی کچھ پناہیں تلاش کرتا ہے، بلکہ اپنی طرف سے پیدا کرتا ہے۔ دیکھا جائے تو اس سماج میں بڑے پیمانے پر اسی انداز کی پناہ گاہوں کو اپنے لیے Protection بنالیتا ہے۔ یہ اس کے پڑاؤ نہیں ہوتے بچاؤ کے ذریعے ہوتے ہیں۔

اب ایسے بھی کچھ لوگ ہوتے ہیں جو وقت کی اپنی سچائیوں پر نظر رکھتے ہیں اور ذہن و فکر کی ان اچھائیوں کو تلاش کرتے ہیں جو رسمی سلسلوں سے روایتوں کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہیں۔ ایسے لوگ اپنے طور پر سوچتے ہیں اور بزرگوں کی پہلے سے چلی آتی ہوئی ڈگر کو چھوڑ دیتے ہیں۔

غالبؔ مذہب کے پابند ضرور تھے، مگر رسم پسندی اور روایت کی پیروی کو وہ چھوڑ دینا چاہتے تھے۔ ان کا فارسی کا مشہور مصرع ہے۔

ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نہ کرد

(یعنی جو صاحب نظر ہوتا ہے وہ بزرگوں کی جانی پہچانی ڈگر سے الگ اپنے فکر ونظر کے سہارے پرنئی راہیں تلاش کرتا ہے)

دور جدید کو اگر دیکھا جائے تو اسی طرح کی فکری روشیں رکھتا ہے۔ پہلے ہم مشرقی آداب و رسوم کو ہی سب کچھ سمجھتے تھے، اب بھی ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے مگر کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جو نئے اندازِ فکر کو اپنا رہے ہیں اور مغربی تہذیب و تعلیم سے بھی استفادہ کرنا یا روشنی لینا چاہتے ہیں۔ غالبؔ ان کے لیے ایک رہنما روشنی ہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ غالبؔ کے یہاں ہمیں تجربے کی زبان ملتی ہے، تجربے سے مراد سائنسی تجربات سے اثر لینا بھی ہے جیسے:

باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

اس وقت دلی کالج میں سائنسی تجربات کا بھی سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور غالبؔ اس سے کلیتاً بے نیاز نہیں ہو سکے۔ ان کا کلکتہ کا سفر بھی انھیں نئی حقیقتوں سے آشنا کرنے کا باعث ہوا۔ نئی شہریت کے معنی کیا ہیں، ان کی سمجھ میں یہ بھی آیا۔ نئے علوم وفنون سے ہمیں کیا مل سکتا ہے۔ ان کا ذہن اس طرف بھی گیا۔ انھوں نے انگریزوں کے لائے ہوئے دستور وآئین کو بھی دیکھا، اس کا اچھا تجربہ بھی ان کو ہوا۔ وہ انگریزوں سے بھی قریب آئے، جنھوں نے آخر بڑھ کر اتنے بڑے ہندستان میں اپنی حکومت قائم کی، جتنا بڑا ہندستان اس سے پہلے کبھی نہیں تھا، اس لیے کہ اشوک، علاء الدین خلجی، اکبر اور عالمگیر کی حکومت میں وہ خطے اور علاقے داخل نہیں تھے جو انگریزوں کی حکومت میں تھے۔

غالبؔ عملاً کس بات کا کتنا تجربہ رکھتے تھے، اس کا پیمانہ چھوٹا بڑا ہو سکتا ہے، لیکن اس کی سوچ کا پیمانہ بہرحال بڑا ہے، اور یہی تو ایک انسان کر بھی سکتا ہے۔ نثر نگاری کے معاملے میں انھوں نے اردو نثر کو جو کچھ دیا اور اس کے آداب نگارش میں جو تبدیلیاں پیدا کیں اور ان کو مقبول بنایا، وہ ان کی ایک اور بڑی دین ہے جس کا دور حاضر سے گہرا رشتہ ہے۔ ان کے اپنے دوست الگ تھے، ان کا ماحول جداگانہ تھا، ان کی اپنی روایت بھی اس روایت سے مختلف تھی، جس میں آج ہم سانس لے رہے ہیں۔ لیکن انھوں نے اپنی ذہانت کی سطح پر سوچنے سمجھنے،

فیصلہ کرنے اور فائدہ اٹھانے کی جو کوشش کی، وہ ہمارے لیے بہت کچھ ہے اور یہی دورِ جدید میں غالبؔ کی معنویت ہے۔

یہ کچھ کم بڑی بات نہیں ہے کہ غالبؔ نے پچھلی ایک صدی سے زیادہ لمبی مدت کے دوران ہمارے بہترین نقادوں، محققوں، شارحوں اور ترتیب و تدوین کا کام کرنے والوں کو متاثر کیا، ان کو راہ دکھائی۔ ان لوگوں میں ہمارے مصور بھی ہیں جو غالبؔ سے متاثر ہوئے۔ غالبؔ کا مطالعہ ایک فلسفی کے طور پر بھی کیا گیا، یعنی وہ فلسفے کے انداز نظر کو شاعرانہ طور پر اپنائے ہوئے تھے، اور ایک ایسے فنکار کے طور پر بھی، جو اپنے دیوان اور مجموعۂ خطوط میں بہت سے ایسے نقوش و آثار چھوڑ گیا، جو نئے دور کے مصوروں کے ذریعے دل آویز مرقعوں میں بدل گئے۔

•••

شمیم حنفی

تفہیم غالبؔ کے مسائل اور ہمارا عہد

یہ بات کہی تو تھی میرؔ صاحب نے کہ "سہل ہے میرؔ کا سمجھنا کیا، ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے۔" لیکن میرؔ سے زیادہ یہ قول غالب پر صادق آتا ہے۔ غالبؔ اپنے زمانے کے ایک چیلنج تھے، ہمارے لیے بھی ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو شاعری کی پوری تاریخ میں مشکل گوئی کا الزام کسی اور بڑے شاعر پر عاید نہیں کیا گیا۔ کسی نے اپنے افکار اور اسالیب بیان کی سطح پر اتنے اعتراضات کا سامنا نہیں کیا، جتنا کہ غالبؔ نے۔ شاعری جیسی بے ضرر سرگرمی کے باعث کسی کی اتنی مخالفت نہیں ہوئی، جتنی کہ غالبؔ کی۔ ناصر کاظمی نے میرؔ کی بابت یہ کہا تھا کہ ہر بڑا شاعر اپنے بعد بہت سے قبیلے چھوڑ جاتا ہے۔ پھر اس کے کلام کا یا سوانح کا جو بھی حصہ کسی کے ہاتھ لگا، وہ اسے لے بھاگتا ہے۔ اس کی تعبیر اتنے مختلف پیرایوں سے اور اتنی متضاد سطحوں پر کی جاتی ہے کہ تعبیر کی کثرت میں حقیقت کہیں گم ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہم تک اگر کچھ پہنچتا ہے تو ایک ادھوری سچائی، ایک جزوی حقیقت، تصویر کا ایک نقطہ یا صرف ایک لکیر۔ پھر محقق ہو یا نقاد، اسی ایک لکیر کو پیٹنے میں عمر گزار دیتا ہے۔

غالب جس دنیا کے باسی تھے، اس دنیا سے غالبؔ کا تعلق ٹوٹے ہوئے بھی آج (2005ء) ایک سو چھتیس برس گزر چکے ہیں۔ گویا کہ کائنات کا، انسانی وجود کا، وقت کا اور حقیقت کا جو تصور غالب رکھتے تھے، وہ ایک صدی سے زیادہ پرانا ہو چکا ہے۔ اگر نسخۂ حمیدیہ یا غالبؔ کے نمائندہ اشعار کے حوالے سے بات کی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالبؔ نے جس ذخیرۂ الفاظ سے کام لیا، اور اظہار و بیان کا جو پیرایہ اختیار کیا، وہ ہمارے عہد تک پہنچے

پہنچتے متروک تو نہیں ہوا ہے، مگر زیادہ مقبول بھی نہیں ہے۔ غالبؔ کے رنگ میں شعر کہنے والے، ان کے اپنے زمانے میں بھی بس اکا دُکا ہی رہے ہوں گے۔ ہمارے زمانے کے بھی گنتی کے کچھ شاعروں نے ان کی روش اختیار کی ہے۔ یہاں مثال کے طور پر میں صرف دو نئے شاعروں کے کلام کا کچھ نمونہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ایک تو نئی نظم کے سب سے معروف شاعروں میں شامل، افضال احمد سید ہیں جنھوں نے ''چھینی ہوئی تاریخ'' کی نثری نظموں سے اپنے سفر کی شروعات کی اور طرز احساس کو رنگا رنگ تجربوں سے ہوتے ہوئے، اپنی غزلوں کے دیوان ''خیمۂ خواب'' تک پہنچے۔ افضال احمد سید کی غزلوں کا انداز حسب ذیل ہے۔

کیا ساعتِ مسعود تھی جس وقت مرا دل
طرزِ سخنِ میرزا نوشاہ پہ آیا

غالبؔ کی تقلید نے افضال احمد سید کی غزلوں میں جو رنگ بکھیرے ہیں، ان کی کچھ مثالیں بھی ملاحظہ ہوں:

اُس شوخ کے ترکش کا میں وہ تیرِ خطا ہوں
جو لوٹ کے پھر اس کی کمیں گاہ پہ آیا

اک عکس چاہیے ہے سرشیشۂ شکست
وہ عکس، بے ارادہ و تدبیر چاہیے

رات اک خیمۂ غم آتشِ خاموش پہ تھا
کچھ ہوائے خنک آثار عنایت کرنے

بہ نوک تیز ہے میرا نوشتۂ تقدیر
کہ مجھ سے ممکن و موہوم میں خلل آیا

سُرابِ عمر سے اک جست میں گزر جاؤں
صلاح رمز شناسانِ خاک و آب سے ہے

اب لطف مجھے ماتم رفتہ سے زیادہ
بربادیِ آئندہ و امروز میں آیا

ان شعروں پر ایک گہری وجودی صورت حال کا سایہ ہے، انسانی تجربوں اور واردات کی وہ نوعیت، جسے پہلی عالمی جنگ (1914ء) کے بعد یورپ میں پنپنے کا موقع ملا اور ہماری ادبی روایت میں جسے ترقی پسند تحریک کی کہولت اور پژمردگی کے دور میں قبولیت ملی۔ اس طرح سے دیکھا جائے تو یہ اشعار بظاہر روایتی آہنگ اور اسلوب رکھتے ہوئے بھی ہمیں نئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان سے یہ حقیقت بھی رونما ہوتی ہے کہ نئے تخلیقی تجربے صرف نئی لفظیات کے پابند نہیں ہوتے۔ اصل مرحلہ ہوتا ہے پرانے لفظوں میں ایک نئے اندرونی ربط اور نئے تلازموں کی دریافت کا۔ اپنے دور میں غالب نے بھی یہ کیا تھا اور بیسویں صدی میں مستحکم ہونے والے نئے میلانات کی ترویج کرنے والے نئے شاعروں نے بھی یہی کیا۔ یہ مسئلہ ایک علاحدہ بحث کا تقاضا کرتا ہے۔ سردست، میں اس سے گریز کا راستہ اپناتا ہوں اور موجودہ زمانے میں غالبؔ سے اپنی حسیت کا تعلق قائم کرنے والے ایک اور شاعر سرمد صہبائی کے کچھ شعر نقل کرتا ہوں۔ یہاں یہ یاد دلاتا چلوں کہ سرمدؔ صہبائی ایک مجنونانہ تخلیقی استعداد رکھنے کے باوجود، اپنے شعری اظہار کے معاملے میں بہت کفایت شعار رہے ہیں۔ ان کی نظم ''تیسرے پہر کی دستک'' اپنے اشتعال انگیز آہنگ اور اپنے وسیع ادراک کے باعث جدید سے مابعد جدید تک، نئی نظم کے کسی بھی ئندہ انتخاب میں جگہ پانے کی مستحق ہے۔ برسوں کی خاموشی کے بعد پچھلے دنوں انھوں نے کچھ غزلیں کہی ہیں اور انداز و اسلوب وہی اختیار کیا ہے جو غالب سے منسوب ہے۔ ان کی غزل کے کچھ شعر سنیے:

عرصۂ خواب میں ہوں ہوش سے رخصت ہے مجھے
گردشِ شام و سحر ساغرِ غفلت ہے مجھے

اک مری لغزشِ پا سے ہے زمانے کو خرام
نغمۂ شہرِ سخن وقفۂ لکنت ہے مجھے

کیوں ہو تنہائی میسّر تجھے اے دل کہ جہاں
خود مرا سایہ بھی ہنگامۂ کثرت ہے مجھے

رونقِ باغِ عدم ہے مرے مرنے کا خمار
لذتِ آبِ فنا وعدۂ جنت ہے مجھے

اس خمِ زلف سے کھلتا ہے مقدر میرا
ظلمتِ چشمِ سیہ مطلعِ قسمت ہے مجھے

بے خبر رکھتا ہے یک رنگیِ عالم سے مجھے
اک تصوّر جو ترا موسمِ حیرت ہے مجھے

بسترِ درد بچھاتا ہوں تو نیند آتی ہے
زیرِ سر سنگِ جنوں بالشِ راحت ہے مجھے

جلوۂ دار دکھاتا ہے مجھے نخلِ بہار
غمزۂ لالہ و گل سنگِ ملامت ہے مجھے

بس کہ بیماریِ جاں میں بھی میں آرام سے ہوں
آمدِ شامِ بلا عیدِ عیادت ہے مجھے

منتِ مرگ ہو کیوں تو ہی بتا شامِ فراق
جب کہ ہر روز یونہی مرنے کی عادت ہے مجھے

جب سے لا حاصلِ جاں حاصلِ جاں ٹھہرا ہے
تنگیِ فکرِ فراواں سے فراغت ہے مجھے

غزوۂ ہجر کی اس معرکہ آرائی میں
گوہرِ اشک درِ زخم غنیمت ہے مجھے

کیوں معاصر نہ ہو وہ غالبؔ آشفتہ مرا
میں ہوں پوشیدہ ولی کفر سے نسبت ہے مجھے

جلسۂ رسمِ سخن عام ہے لیکن سرمدؔ
اس کی آواز کہن لہجۂ جدّت ہے مجھے

میں چند شعر نقل کرنا چاہتا تھا۔ ایک ایک کرکے پوری غزل ہی آپ کو سنا ڈالی۔ یہ معاملہ بھی بھلا اردو کے اور کس شاعر کے ساتھ ہوا ہے کہ ہر دور میں اسے اس طرح اپنا معاصر تسلیم کرلیا جائے۔ غالبؔ کی انفرادیت کا کمال یہ ہے کہ اپنے تجربوں اور احساسات کو، لفظوں اور بیان کو، ایک خاص پہچان دینے کے باوجود، وہ اپنے چاروں طرف کوئی دیوار نہیں بننے دیتی۔ نہ وقت کی، نہ مقام کی، نہ فکر کی، نہ جذبے کی، نہ زبان کی، نہ بیان کی۔ دو چار شعر تو پرانے سے پرانے شاعر کے یہاں ایسے مل جائیں گے جن میں ہم اپنی ہستی یا اپنے زمانے کا عکس ڈھونڈ نکالیں۔ اس میں دیسی بدیسی کی بھی کوئی قید نہیں۔ ہر زبان اور ہر زمانے کی اداس اور پریشاں روحوں کو شاعری اسی طرح ایک میں یکجا کردیتی ہے اور زبان، تہذیب، مسلک، عقیدے، زمانے کے اختلاف کے باوجود وہ آپس میں مکالمہ قائم کرلیتے ہیں۔ میرؔ، مصحفیؔ،

منتِ مرگ ہو کیوں تو ہی بتا شامِ فراق
جب کہ ہر روز یونہی مرنے کی عادت ہے مجھے

جب سے لا حاصلِ جاں حاصلِ جاں ٹھہرا ہے
تنگیِ فکرِ فراواں سے فراغت ہے مجھے

غزوۂ ہجر کی اس معرکہ آرائی میں
گوہرِ اشک درِ زخم غنیمت ہے مجھے

کیوں معاصر نہ ہو وہ غالبؔ آشفتہ مرا
میں ہوں پوشیدہ ولی کفر سے نسبت ہے مجھے

جلسۂ رسمِ سخن عام ہے لیکن سرمدؔ
اس کی آواز کہن لہجۂ جدّت ہے مجھے

میں چند شعر نقل کرنا چاہتا تھا۔ ایک ایک کر کے پوری غزل ہی آپ کو سنا ڈالی۔ یہ معاملہ بھی بھلا اردو کے اور کس شاعر کے ساتھ ہوا ہے کہ ہر دور میں اسے اس طرح اپنا معاصر تسلیم کر لیا جائے۔ غالبؔ کی انفرادیت کا کمال یہ ہے کہ اپنے تجربوں اور احساسات کو، لفظوں اور بیان کو، ایک خاص پہچان دینے کے باوجود، وہ اپنے چاروں طرف کوئی دیوار نہیں بننے دیتی۔ نہ وقت کی، نہ مقام کی، نہ فکر کی، نہ جذبے کی، نہ زبان کی، نہ بیان کی۔ دو چار شعر تو پرانے سے پرانے شاعر کے یہاں ایسے مل جائیں گے جن میں ہم اپنی ہستی یا اپنے زمانے کا عکس ڈھونڈ نکالیں۔ اس میں دیسی بدیسی کی بھی کوئی قید نہیں۔ ہر زبان اور ہر زمانے کی اداس اور پریشاں روحوں کو شاعری اسی طرح ایک میں یکجا کر دیتی ہے اور زبان، تہذیب، مسلک، عقیدے، زمانے کے اختلاف کے باوجود وہ آپس میں مکالمہ قائم کر لیتے ہیں۔ میرؔ، مصحفیؔ،

سوداؔ، دردؔ، قائمؔ، نظیرؔ سے لے کر ہمارے اپنے دور تک، ایسے بہت سے شعروں، نظموں، غزلوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جو اس دور کے طرزِ احساس سے مناسبت رکھتی ہوں اور ہمارے اپنے تجربوں یا گرد وپیش کی حقیقتوں کی ترجمان کہی جاسکیں۔ لیکن غالب کے ساتھ تو قصہ ہی کچھ اور ہے۔ وہ اپنی کمزوریوں اور خوبیوں، اپنی ہزیمتوں اور اپنی کامرانیوں سمیت تمام وکمال ہمارے ساتھ آ کھڑے ہوتے ہیں اور ان سے ذہنی و جذباتی رفاقت کا رشتہ استوار کرنے میں ہمیں دیر نہیں لگتی۔ ہر زمانہ، غالب کی شاعری میں اپنی ذہنی زندگی کے آثار دریافت کرلیتا ہے۔ ہر شخص غالب کو اپنے حساب سے پڑھتا ہے۔ اپنی تربیت اور ترجیحات کے مطابق ان سے معنی اخذ کرلیتا ہے۔

اور یہ صورت حال صرف اردو یا فارسی والوں سے مخصوص نہیں ہے۔ ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں ہماری ادبی روایت سے شغف رکھنے والوں نے شاید سب سے زیادہ توجہ غالبؔ کی تفہیم وتعبیر اور ترجمے پر صرف کی ہے۔ اس ضمن میں، یہاں میں ہندستان کی مختلف زبانوں کے چند لکھنے والوں کی مثال دوں گا۔ ان کے کچھ اقتباسات کی مدد سے، مجھے عرض یہ کرنا ہے کہ غالبؔ نے اپنی فکر اور فنی حکمت عملی یا تخلیقی حربوں کی وساطت سے، بہ ظاہر مختلف اور نامانوس زمانی، مکانی، ادبی اور تہذیبی پس منظر رکھنے والے ادیبوں کے شعور میں بھی اپنی جگہ بنائی ہے۔ یہاں اپنی بات میں اشوک باجپئی کے ایک بیان سے شروع کرتا ہوں۔ یہ لفظ انہی کے ہیں۔ (ترجمے کے ساتھ)

> ہماری صورت حال، یعنی ہندوستانی صورت حال میں غالب پہلے جدید شاعر ہیں...... تین معنوں میں وہ تجدد کے، وہ پہلے کلاسیک ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کے یہاں فرد شاعری کے مرکز میں موجود ہے۔ بغیر کسی استواری جہت، بغیر کسی روایتی آدرش اور ایقان کے......ایک نہتے انسان کی شکل میں۔ دوسری بات غالب کا استفہامیہ مزاج ہے، ہر بات پر وہ سوال قائم کرنے کی جرأت (رکھتے ہیں) وہ دنیا کے تماشے پر سوال، اپنے وقت پر سوال اٹھاتے ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ غالبؔ کے یہاں ہندی اور فارسی روایت کا ایک امتزاج، ایک معنی خیز باہمی ربط ملتا ہے۔ ہندی روایت کو غالبؔ کی شاعری میں ایک نئی

ڈاکٹر عقیل احمد

کچھ غالب کے بارے میں

غالب نے کہا تھا کہ میری شاعری کا تجزیہ سو سال بعد کیا جائے گا۔ غالب کی یہ پیش گوئی سچ نکلی۔ غالب کے مرنے کے سو سال بعد سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر غالب کو سمجھنے کی کوشش شروع ہوئی۔ 1969ء میں غالب صدی کے موقع پر پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ جناب حکیم عبدالحمید صاحب نے غالب کے مزار کے پاس غالب کی یاد میں غالب اکیڈمی کی صورت میں غالب کی یادگار قائم کی۔ ہم اپنی ایک ہزار سالہ تہذیب کی تاریخ دیکھیں تو پورا ایک دور ویرگا تھا کال کا ملے گا۔ جو مرزا غالب سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ غالب کے آباؤ اجداد سپاہی تھے۔ ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ ایک جنگ میں لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ انہوں نے الور کے راجا بختاور سنگھ کی فوج میں بھرتی ہونا پسند کیا تھا۔ وہ محمد شاہ کے زمانے میں سمرقند سے ہندوستان آ گئے تھے اور شاہ عالم کی فوج میں پچاس گھوڑوں کے کماندار بن گئے تھے۔ غالب نے اپنے لیے کہا تھا کہ میرے اجداد سو پشتوں سے سپہ گری کے پیشے سے وابستہ ہیں اور اس میدان میں ان کا نام ہے۔ ہمیں شاعری کے ذریعہ اپنی عزت نہیں بڑھانی ہے۔ ان کا شعر ہے

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری　　　کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

غالب ہمارے ملک کے ایسے شاعر ہیں جن کی مقبولیت پوری دنیا میں ہے اور غالب پر جتنے مضامین اور کتابیں لکھی گئیں کسی اور شاعر کے بارے میں نہیں لکھی گئیں۔ سبھی ہندستانی زبانوں اور غیر ملکی زبانوں میں غالب پر کتابیں مل جائیں گی۔ لیکن اب بھی غالب کے بارے میں بہت سی باتیں سامنے نہیں آئی ہیں۔ غالب کا پورا نام کیا تھا؟ ان کی پیدائش کب ہوئی؟ غالب کی زندگی پر لکھی جانے

والی پہلی کتاب ''یادگار غالب'' میں مولانا الطاف حسین حالی لکھتے ہیں:

''مرزا اسد اللہ خاں غالب المعروف بہ مرزا نوشہ و نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ المتخلص بہ غالب در فارسی و اسد در ریختہ، شب ہفتم ماہ رجب 1212 ہجری کو آگرہ شہر میں پیدا ہوئے۔''

یہاں مولانا حالی غالب کا پورا نام نہیں لکھتے، جو نام چلن میں تھا وہی لکھ دیا۔ نیشنل آرکیالوجیکل کے سابق ڈائریکٹر سید اکبر علی ترمذی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ غالب کا پورا نام محمد اسد اللہ خاں ہے۔ اپنی اس بات کو ثابت کرنے کے لیے انہوں نے غالب کے ایک خط کا حوالہ دیا ہے جو منشی ہرگوپال تفتہ کے خط کا جواب ہے جس میں غالب نے لکھا ہے:

''سنو صاحب! لفظ مبارک میم، ہے، میم، دال (محمد) کے ہی حرف پر میری جان نثار، مگر چونکہ یہاں سے ولایت تک حکام کے یہاں یہ لفظ یعنی محمد اسد اللہ خاں نہیں لکھا جاتا میں نے بھی موقوف کر دیا ہے۔''

اس کے علاوہ چار دسمبر 1867ء کے ایک مختار نامے پر جو ان کے دستخط ہیں اس میں محمد اسد اللہ خاں غالب تھا۔ غالب اور اسد ان کے تخلص تھے جن کا استعمال وہ اپنی تحریروں میں کیا کرتے تھے۔ لیکن غالب نے اپنے اوپر کبھی کوئی پابندی نہیں لگائی۔ وہ آزاد مزاج کے تھے اور ہمیشہ انہوں نے آزادی سے جینے کی کوشش کی۔ وہ اپنا نام کبھی محمد اسد اللہ خاں لکھتے اور کبھی اسد اللہ ہی لکھتے۔

نام کی طرح غالب کی پیدائش کے بارے میں بھی اختلافات ہیں۔ غالب نے اپنی پیدائش کی جو تاریخ لکھی وہ آٹھ رجب 1212 ہجری پیر کا دن ہے۔ ہجری سن کو عیسوی سن میں بدل کر دیکھا جائے تو 27 دسمبر 1797ء کی تاریخ نکلتی ہے لیکن اس تاریخ کو پیر کی جگہ بدھ تھا۔ مالک رام غالب کی پیدائش کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مرزا 8 رجب 1212 ہجری 27 دسمبر 1797ء کی بدھ کے دن سورج نکلنے سے چار گھڑی پہلے آگرہ میں پیدا ہوئے۔''

غالب جب پانچ سال کے ہوئے تو ان کے والد عبداللہ بیگ کا انتقال ہو گیا۔ ان کی دیکھ ریکھ ان

کے چچا نصر اللہ نے کی۔ لیکن 1806ء میں نصر اللہ بیگ بھی اس دنیا سے چلے گئے۔ اب غالب اپنے ننہال آ گئے۔ غالب نے ابتدائی تعلیم مولوی محمد معظم سے حاصل کی۔ غالب کو فارسی سے خاص لگاؤ تھا۔ مولوی محمد معظم کے پاس تعلیم پا ہی رہے تھے کہ شاعری شروع کر دی۔ تیرہ برس کی عمر میں 9راگست 1810ء کو ان کی شادی الٰہی بخش خاص معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے ہو گئی اور وہ آگرہ چھوڑ کر دلی چلے آئے۔ اور گلی قاسم جان اور حبش خاں کے پھاٹک کے آس پاس کرائے کے مکان میں رہنے لگے۔ دلی میں انہوں نے کوئی مکان نہیں بنوایا اور نہ خریدا۔ گلی قاسم جان کے مکان میں ہی 15رفروری 1869ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کا گھر مسجد کے قریب تھا جس کے بارے میں اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں ۔

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے　　　یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

مرزا غالب کی ساری عمر پڑھنے لکھنے میں گذری۔ مولانا حالی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ جس طرح غالب نے اپنے لیے کبھی کوئی مکان نہیں خریدا اسی طرح انہوں نے کبھی کوئی کتاب نہیں خریدی۔ ایک آدمی کا یہی کاروبار تھا کہ کتب فروش کی دوکان سے لوگوں کو کرائے کی کتابیں لاکر دیا کرتا تھا مرزا غالب بھی اسی سے کرائے پر کتابیں منگواتے تھے اور پڑھنے کے بعد واپس کر دیتے تھے۔ غالب کے سسر الٰہی بخش خاں معروف صرف شاعر ہی نہیں صوفی بھی تھے۔ غالب کو ان کی محفلوں میں حصہ لینے کا موقع ملا۔ یہاں انہیں تصوف کے مسائل کو بھی جاننے کا موقع ملا۔ اس کا ان کی شاعری پر گہرا اثر دکھائی دیتا ہے۔ وہ وحدۃ الوجود پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا　　　ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اور تصوف کے بارے میں لکھتے ہیں۔

یہ مسائل تصوف، یہ ترا بیان غالب　　　تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

چچا کے انتقال کے بعد غالب کو روک ٹوک کرنے والا کوئی نہیں رہا۔ ننہال میں بھی کوئی بولنے والا نہ تھا۔ غالب کا مزاج آزاد تھا ایسی حالت میں وہ اور بھی آزاد ہو گئے۔ اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

دلی میں غالب ایک ڈومنی کے پیار کا شکار ہو گئے اور ایک غزل انہوں نے اس کی یاد میں لکھی جس کا ایک شعر ہے۔

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم! تری غفلت شعاری ہائے ہائے

1826ء میں الٰہی بخش معروف کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بھائی یوسف پاگل ہو گئے۔ انگریزی سرکار کی بندھی ہوئی پینشن جو فیروز پور جھرکا سے ملتی تھی اس سے گذارا مشکل ہو گیا۔ اپنے ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

''میاں بے رزق جینے کا ڈھنگ آ گیا ہے، اس طرف سے خاطر جمع رکھنا، رمضان کا مہینہ روزے کھا کھا کر کاٹا، آگے خدا رزاق ہے، کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔''

یہ خط میر مہدی کو غالب نے لکھا تھا۔ میر مہدی نے خط لکھ کر پینشن کے بارے میں معلوم کیا تھا۔ پینشن کے سلسلے میں غالب نے چالیس سال کی عمر میں کلکتے کا سفر کیا۔ کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ، الہ آباد اور بنارس میں ٹھہرے۔ الہ آباد میں ان کی طبیعت خراب ہو گئی تھی، بنارس پہنچنے پر وہ ٹھیک ہو گئے۔ دو سال کلکتے میں رہے لیکن کوئی کامیابی نہیں ملی۔ بلکہ غالب کے کلام پر لوگوں نے اعتراض کیا تھا۔ انہوں نے تنگ آ کر ایک نظم ''بادِ مخالف''، لکھی تھی۔

مرزا غالب ایک باصلاحیت اور خوددار انسان تھے۔ یہ واقعہ کافی مشہور ہے کہ مرزا غالب دلی کالج میں ٹیچر کے عہدے کے لیے انٹرویو دینے گئے اور کالج کے سکریٹری دروازے پر ان کے استقبال کے لیے نہیں آئے۔ کچھ دیر کے بعد آئے اور کہنے لگے کہ گورنر کے دربار میں جب آپ آئیں گے تو اسی طرح استقبال کیا جائے گا۔ لیکن اس وقت آپ نوکری کے لیے آئے ہیں اس موقع پر وہ سلوک نہیں ہو سکتا۔ مرزا غالب نے جواب میں میں کہا تھا کہ نوکری کا ارادہ اس لیے کیا تھا کہ عزت

میں اضافہ ہوگا اور جو عزت اس وقت ہے اس میں بھی کمی آ جائے تو مجھ کو ایسی نوکری نہیں چاہیے۔ غالب کی زندگی کا وہ اہم واقعہ یہ بھی ہے کہ شطرنج اور چوسر کھیلتے ہوئے پکڑے گئے اور قید کر لیے گئے۔ چھ مہینے کی سزا ہوئی تین مہینے میں رہائی مل گئی۔ اور میاں کالے صاحب کے یہاں رہنے لگے۔ کالے صاحب، بہادر شاہ کے شیخ اور مولانا فخر الدین کے پوتے تھے۔ مولانا حالی کا خیال ہے کہ ان کے تعلقات کی وجہ سے مرزا غالب کا رشتہ قلعہ سے پیدا ہوا تھا۔ اور بہادر شاہ ظفر نے نجم الدولہ نظام جنگ، دبیر الملک کے اعزاز سے نوازا تھا اور تیمور یہ خاندان کی تاریخ لکھنے کے لیے پچاس روپے مہینہ کا وظیفہ بھی طے کر دیا تھا۔ شیخ ابراہیم ذوق کے مرنے کے بعد غالب کو استاد بنا لیا تھا۔

1857ء کے غدر سے دلی شہر کا برا حال ہو گیا۔ غالب کی پینشن بھی بند ہو گئی اور بہادر شاہ کا جاری کیا ہوا وظیفہ بھی۔ یہ دو ذریعے تھے مرزا کی آمدنی کے۔ دو سال بعد نواب رام پور نے سو روپے مہینہ کا وظیفہ جاری کر دیا جو ان کی زندگی تک جاری رہا۔ غالب کی زندگی دکھ سے بھری ہوئی ہے۔ بچپن میں باپ اور چچا کی موت۔ جوان بھائی کا پاگل ہو کر مر جانا۔ سات بچے پیدا ہوئے لیکن زندہ ایک بھی نہ رہا۔ ان کی بیوی کے بھانجے زین العابدین عارف کا انتقال ہو گیا تو ان کے دو چھوٹے بچوں کو اپنے گھر میں پالا پوسا۔ ان دو بچوں کا بھی جوانی میں ہی انتقال ہو گیا۔ ایسی دکھ بھری زندگی میں غالب نے ہنسی کا سہارا لیا۔ دکھ میں انہوں نے ہنسنا سیکھ لیا۔ خود ہنستے دوسروں کو بھی ہنساتے، اپنے اوپر ہنستے۔ ان کے لطیفے بہت مشہور ہوئے۔ ایک لطیفہ یہ ہے کہ کسی آدمی نے مرزا کو نصیحت دی کہ شراب بڑی خراب چیز ہے، شرابی کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ مرزا نے کہا، ''بھائی جس کو شراب مل جائے اس کو اور کیا چاہیے۔'' غالب بڑے عقلمند اور دور اندیش تھے۔ ان کی سوچنے کی طاقت بہت تیز تھی۔ انہوں نے اپنے وقت کے مخالف آزادی سے چلنے کی کوشش کی۔ اور یہی کوشش ان کے کلام میں بھی ملتی ہے۔ خط لکھنے کا انہوں نے ایک نیا طریقہ نکالا اور اس طرح سے خط لکھے جیسے دو دوست باتیں کر رہے ہیں۔ شاعری جو ان کے زمانے میں پسند نہیں کی گئی آج ایک ایک شعر پر لوگ سر دھنتے ہیں۔ اس کی وجہ غالب کی دور اندیشی ہے۔ غالب نے اپنے کلام میں جو باتیں کہیں وہ ہر وقت میں صحیح ثابت ہونے

الی ہیں۔ جیسے

عشق نے غالب نکما کر دیا　ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا　آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا　اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری بلا ہے　مجھے کیا برا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا

ہے خبر گرم ان کے آنے کی　آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے　دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

آئینہ دیکھ، اپنا سا منہ لے کے رہ گئے　صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟　کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر　جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک　کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

کہتے ہیں، جیتے ہیں امید پہ لوگ　ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

یہ غالب کے کلام کی کچھ مثالیں ہیں جو اس زمانے میں بھلے ہی نہ پسند کئے گئے ہوں۔ لیکن آج یہ سب کے دل کی تسلی کے لیے بہت کارآمد ہیں۔ اور سبھی ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اب غالب کے خیال کی یہ مثال دیکھئے

جوے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

یہاں ویوگ کے شام کی بات ہے کہ آنکھوں سے خون کے دریا بہنے دو۔ شاعر نے یہاں یہ خیال کیا ہے کہ دو چراغ جل اٹھیں گے۔ آنکھوں سے خون کا دریا بہنا اور پھر اسے چراغ سمجھنا کتنا دور کا خیال ہے۔ اس شعر سے ویوگ کی تکلیف کو جس طرح بیان کیا گیا ہے اس کا تخیل دشوار ہے۔

☆☆☆

الی ہیں۔ جیسے

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا، اگر ایک بات ہوتا

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

آئینہ دیکھ، اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

کہتے ہیں، جیتے ہیں امید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

یہ غالب کے کلام کی کچھ مثالیں ہیں جو اس زمانے میں بھلے ہی نہ پسند کئے گئے ہوں۔ لیکن آج یہ سب کے دل کی تسلی کے لیے بہت کارآمد ہیں۔ اور سبھی ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اب غالب کے خیال کی یہ مثال دیکھئے

جوے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

یہاں وییوگ کے شام کی بات ہے کہ آنکھوں سے خون کے دریا بہنے دو۔ شاعر نے یہاں یہ خیال کیا ہے کہ دو چراغ جل اٹھیں گے۔ آنکھوں سے خون کا دریا بہنا اور پھر اسے چراغ سمجھنا کتنا دور کا خیال ہے۔ اس شعر سے وییوگ کی تکلیف کو جس طرح بیان کیا گیا ہے اس کا تخیل دشوار ہے۔

☆☆☆

جہانِ غالب

یادگار حکیم عبدالحمیدؒ

جلد:8 شمارہ:15 دسمبر 2012 تا مئی 2013ء

قیمت فی شمارہ:-/20 روپے

قیمت سالانہ:-/40 روپے

ڈاک سے: -/50 روپے

کمپوزنگ: بشریٰ بیگم

طابع و ناشر

ڈاکٹر عقیل احمد

سکریٹری: غالب اکیڈمی

بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی۔110013

فون نمبر:9868221198, 24351098

ای میل:ghalibacademy@rediffmail.com

ویب سائٹ:www.ghalibacademy.org

پرنٹر، پبلشر ڈاکٹر عقیل احمد نے غالب اکیڈمی کی طرف سے ایم آر پرنٹرس 2816 گلی گڑھیا، دریا گنج، نئی دہلی سے چھپوا کر غالب اکیڈمی 168/1 بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی 13 سے شائع کیا۔ ایڈیٹر: عقیل احمد

ڈاکٹر نیلوفر نازنحوی

غالب بحیثیت فارسی شاعر

اسد اللہ خان نام، مرزا نوشہ خان عرف نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ خطاب تھا۔ پہلے پہل اسد تخلص تھا اور بعد میں غالب ہوگیا۔ ان کا خاندان ایران سے تھا۔ ان کے دادا شاہ عالم کے زمانے میں دلی آئے تھے۔ ان کے والد آصف الدولہ کے زمانے میں لکھنو آئے تھے۔ لکھنو سے حیدر آباد چلے گئے۔ غالب نے آگرہ میں 1797 میں اپنی آنکھیں اس دنیا میں کھولیں بعد میں دلی میں رہائش پذیر ہوئے۔ ابھی پانچ سال کے ہوئے تھے کہ والد نے اس جہاں فانی سے کوچ کیا۔ 1869 میں غالب نے اس جہان فانی کو خیر باد کہا۔

غالب اردو کے ایک بہت بزرگ شاعر مانے جاتے ہیں۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اردو غزل کا بادشاہ ہے اردو میں اس کا ایک دیوان ہے اور اس کے علاوہ فارسی میں بھی اس کا ایک دیوان ہے۔ مگر اس نے اپنے اردو دیوان کو "بے رنگ" دیوان سے یاد کیا ہے اور فارسی دیوان کو "دیوان رنگ رنگ" سے یاد کیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے فارسی دیوان میں رنگ برنگ کے نقوش ہیں اور اردو دیوان بے رنگ ہے وہ دونوں زبانوں کو یکساں پسند کرتے تھے اور ہر دو زبانوں کے استاد تھے۔ یہی نہیں بلکہ دونوں صنفوں کے بھی استاد تھے۔ یعنی نظم اور نثر۔ اردو زبان میں خطوط نویسی کے بنیاد گذار بھی ہیں۔ کیونکہ یہی طرز تحریر جدیدیت کی علم اٹھائے ہے۔ اس کے نوشتے شیرین اور شگفتہ ہیں۔ فارسی میں ان کا جو دیوان ہے چاہتے تھے کہ لوگ انہیں اسی کے توسط سے یاد کریں۔ لیکن لوگوں کو ان کے اردو اشعار زیادہ پسند ہیں۔ ان کے اردو اشعار کو پڑھتے ہیں، یاد کرتے ہیں اور ان سے محظوظ ہوتے ہیں۔ ان کے اشعار کو لوگ اپنی گفتگو میں محاوروں کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور کبھی کبھی ایک کلمہ کو تبدیل کر کے اس وزن پر دوسرا کلمہ وہاں پر استعمال کرتے

ہیں اور اپنا کام نکالتے ہیں۔ ان کے فارسی اشعار بہت معنی خیز ہیں اور فہم وفراست میں اولی ہیں۔ چنانچہ خود کہا ہے۔

فارسی بین تا ببینی نقش ہای رنگ رنگ بگذراز مجموعہ اردو کہ بی رنگ من است

اگر تمہیں رنگین نقوش دیکھنے ہیں تو تم میرا فارسی کلام دیکھو۔ میرے اردو کلام کو رہنے دو کیونکہ وہ میرا بے رنگ کلام ہے۔ لیکن ہم نے غالب کے فارسی کلام کے ساتھ بڑی ناانصافی برتی ہے اور وہ ناانصافی آج بھی ہو رہی ہے۔ کیونکہ ہم فارسی پڑھنے والے یا پڑھانے والے قدیم اساتذہ کا کلام درس و تدریس کے تحت پڑھتے پڑھاتے تو ہیں مگر غالب جیسے استادوں کے کلام کو فارسی نصاب میں شامل نہیں کرتے اس وجہ سے فارسی کے شاگرد غالب سے ناآشنا رہتے ہیں۔

آج کل فارسی سے شغف رکھنے والے لوگوں نے غالب کو جاننا شروع کیا ہے۔ کچھ لوگوں نے غالب کے اشعار پر کتابیں لکھی ہیں۔ شفیع شوق صاحب نے غالب کے چند اشعار کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس ترجمہ سے لوگ جو فارسی جاننے والے نہیں بھی ہیں غالب کو پڑھ سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں۔ علی اصغر حکمت صاحب نے غالب کو ہند کا خاتم الشعرا کہا ہے داریوش صاحب تاریخ ادبیات فارسی میں غالب کی جگہ کو مشخص کرتے ہیں

غالب کہ کلام او ثاقب بود استاد حزار طالب وصائب بود

در ملک سخن چون اسد للہی کرد برجملہ سخنوران فروزان غالب بود

غالب جانتے تھے کہ ان کی وفات کے بعد ان کی شاعری کی شہرت ہوگی اور لوگ ان کی شاعری سے مست ہو جائیں گے۔ مگر ان کے دور میں اس کے خریداروں کا قحط تھا۔

تازدیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن این مئی از قحط خریداری کہن خواہد شدن

کوکبم رادرعدم اوج قبولی بودہ است شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

غالب کے بارے میں مشہور ہے کہ جب وہ کسی مشاعرے میں جاتے تھے اور کوئی غزل پڑھتے تھے۔ لوگ چونکہ ان کے اشعار کو نہیں سمجھتے تھے۔ اس لئے داد تحسین نہیں دیتے تھے اور نہ ہی

ان کے اشعار سے کوئی لذت ہی لیتے تھے وہ اس وقت ان سے بددل ہو جاتے اور کہتے۔"لوگ میرے اشعار کو نہیں سمجھتے ہیں تو لعنت ہے۔"

بے شک غالب کے چند ایک اشعار سبک ہندی میں لکھے گئے ہیں اور دیکھنے اور سننے میں مشکل پسند ہیں۔لیکن جب ہم دقت کے ساتھ ان کے اشعار پڑھتے ہیں تب سمجھتے ہیں کہ ان کے اشعار کس قدر معنی و ادراک کے الفاظ اس میں پروئے ہوئے ہیں۔

معشوق کی بے وفائی جس کو عام طور پر فارسی شاعری میں خاص جگہ دی گئی ہے۔ذیل کے اشعار میں دیکھا جاسکتا ہے کہ محبوب کی بے وفائی کے مضمون کو غالب نے کس طرح باندھا ہے۔

زما گسستی، وبا دیگران گروبستی　　بیا کہ عہد وفا نیست استوار بیا

(ہم سے دور جا کر دوسروں کے ساتھ تم نے گٹھ جوڑ باندھ لیا۔آجاؤ کیونکہ عہد وفا استوار نہیں ہے)

وداع و وصل جدا گانہ لذتی دارد　　ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا

(وداع و وصل ہر دو کی اپنی اپنی لذت ہے مگر اگر تم ہزار بار جاؤ گے تو لاکھ بار واپس آجاؤ۔)

اور غالب حسن معشوق کی تعریف و توصیف کرتا ہے تو کبھی اس کو تابناکی آفتاب کہہ دیتا ہے اور کبھی معشوق کے حسن کی پرستش کرتا ہے۔

میں چاہتی ہوں کہ غالب کی ایک غزل کی توضیح دوں اور قاری کے سامنے رکھوں۔مجھے یقین ہے کہ اگر غالب نے فارسی کا دیوان نہ لکھا ہوتا صرف ذیل کی غزل ہی لکھی ہوتی تب بھی فارسی زبان و ادبیات پر غالب ہوتی۔

بیا وجوش تمنائے دیدنم بنگر　　چو اشک از سر مژگان چکیدنم بنگر

میرے محبوب آجاؤ دیکھو کہ تمہیں دیکھنے کی کیسی تمنا میری آنکھوں میں ہے۔اشکوں کی طرح مژگان سے میرا ٹپکنا دیکھو۔

زمن بجرم تپیدن کنارہ می کردی　　بیا بخاک من وآرمیدنم بنگر

ہمیشہ میری بے قراری کے جرم کے لیے تم نے مجھ سے کنارہ کیا۔اب آج میری خاک پر آجاؤ اور میرا آرام سے رہنا دیکھو

شنیده ام که نه بینی وتا امید نیم　　ندیدن تو شنیدم، شنیدنم بنگر

میں نے سنا کہ تو مجھے نہ دیکھے گا۔مگر تو اس بات کی طرف توجہ دے کہ یہ بات سننے کے بعد بھی امیدوار ہوں۔میری قوی السمیع کی داد دے۔کہ اس بدخبر کے بعد بھی زندہ ہوں۔

دمید دانہ، بالید و آشیا نگہ شد　　در انتظار ہما دام، چیدنم بنگر

یہ شعر تو اس غزل کا شاہ بیت ہے۔کیا کلمات کے لحاظ سے اور کیا تراکیب کے لحاظ سے۔کس قدر خوشنما اور دلکش ہے۔غالب نے دام میں دانہ ڈالا تھا کہ ہما اس کے دام پھنس جائے۔مگر اس کی بدقسمتی دیکھئے کہ وہ دانہ اگ گیا، بڑا ہوگیا، اور ایک ایسے درخت کی شکل میں آگیا کہ اس پر چڑیوں نے گھونسلے بنائے اور میں انتظار ہی کرتا رہا۔

نیاز مندیٔ حسرت کشان نمی دانی　　نگاہ من شو و دزدیده دیدنم بنگر

تمہیں معلوم نہیں کہ کس قدر حسرت دیدار اور حسرت نیاز مندی ہے۔اگر تم میری حسرت دیکھنا چاہتے ہو تو میری آنکھ بن جاؤ اور میں کیسی دزدیدہ نگاہی سے تمہیں دیکھتا ہوں وہ دیکھ لو۔

اگر ہوای تماشای گلستان داری　　بیاد عالم درخون تپیدنم بنگر

اگر میرے معشوق تمہیں گلستان دیکھنے کی آرزو ہے تو آجاؤ دیکھ لو کہ میں عالم خون میں کس قدر گل و گلستان ہو چکا ہوں

غالب ہمیشہ عاشقوں کے دلوں میں رہیں گے۔وہاں زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ایک زمانہ آئے گا جب ہم غالب کو نہ صرف اردو بلکہ فارسی کے توسط سے بھی یاد کریں گے اور غالب کو فارسی کے توسط سے بھی سلام بھیجیں گے۔

OO